دیوانِ طباطبائی

یعنی

صوتِ تغزل

سلسلہ مطبوعات مکتبہ ابراہیمیہ

(۱)

دیوانِ طباطبائی

یعنی

صوتِ تغزل

۱۹۳۳

مجموعہ کلام

نواب حیدر یار جنگ بہادر علامہ علی حیدر طباطبائی نظمؔ

ناشر

انجمن امداد باہمی مکتبہ ابراہیمیہ (محدود) حیدرآباد دکن

۱۹۳۳ء
۱۳۵۱ھ

دفعہ اول
(۱۰۰۰)

باسمہٖ سبحانہٗ تعالیٰ

ادب الکاتب والشاعر

غزل

تمام دنیا کی شاعری میں مضمون پہلے مقرر ہو جاتا ہے پھر اس مضمون کے مناسب قافیے اختیار کیے جاتے ہیں۔

غزل ایک ایسی صنف شعر ایران میں ایجاد ہوئی جس میں مضمون سے پہلے قافیہ و ردیف مقرر کر لیتے ہیں پھر اسی قافیہ و ردیف کے مناسب مضامین اختیار کرتے ہیں۔

قافیہ و ردیف کے تعین یا چوسر کے پانسے میں چھکا بھی نکل آتا ہے پو بھی نکل آتی ہے۔

یہ دو لومیں ہیں جن سے مضمون کا طلسم کھل جاتا ہے۔

دو میل راہ میں جو مضموں کا پتہ بتا دیتے ہیں ۔ جو شخص پتہ کو سمجھ جاتا ہے منزل مقصود تک پہنچ جاتا ہے ۔ نہیں تو بھٹک کر گم کردہ راہ ہو جاتا ہے ۔

غزل گو قرعہ پھینکتا ہے اور اُس کی قسمت کا جو ہم ہے نکل آتا ہے ۔

قافیہ ورديف دو پر پرواز ہیں جس سے کبھی غزل گو عرش تک پہنچ جاتا ہے اور خزانۂ عرش سے مضمون اڑا لاتا ہے ۔ ؎

لے گئی عرش معلی پہ مجھے فکر سخن
جا پڑا پر تو آئینۂ زانو ہو کر

اس کے علاوہ ردیف میں محاورے کی شوخی پیدا کرنا سننے والوں کے دل کو بے چین کر دیتا ہے مرزا داغ مرحوم کو اس باب میں ید طولیٰ حاصل تھا ۔

(لگی ہوئی) ردیف ہے اس میں داغؔ نے یہ شعر نکالا ؎

جب میں نے آہ کی ہے قیامت اٹھائی ہے
آواز پہ ہے شورش محشر لگی ہوئی

(کچھ بھی نہیں) ردیف ہے اس میں یہ شعر نکالا ؎

دھوم ہے حشر کی سب کہتے ہیں یوں ہی دوں ہے
فتنہ ہے اک تری ٹھوکر کا مگر کچھ بھی نہیں

حیرت تو یہ ہوتی ہے کہ (کا) ردیف ہے اس میں زبان کا مزہ دیکھیے ؎

اٹھنا ہی اسکی بزم سے دشوار تھا مجھے
اور پھر سنبھالیا دل بے اختیار کا

شعر کی ان دونوں صنفوں میں فرق یہ ہے کہ پہلی صنف میں عروض کا ایک وزن ہونا کافی ہے جو قریب قریب موسیقی کا ایک وزن ہوتا ہے قافیہ کا ہونا نہ ہونا زبان کی ساخت پر منحصر ہے۔ اور اس جدید صنف میں وزن بھی قافیہ بھی بلکہ ردیف کا بھی ہونا ضرور ہے معنوی اعتبار سے دونوں میں بڑا فرق یہ ہے کہ اوس میں تسلسل ضرور ہے اور اس میں قافیہ وردیف جو رستہ بتائے غزل گو کو اسی طرف جانا چاہیے مثلاً محمل کا قافیہ شاعر کو نجد کی طرف لے گیا اور بسمل نے اوسے مقتل کی طرف کھینچا اس وجہ سے غزل میں تسلسل باقی نہ رہا۔ اور تسلسل نہ ہونے سے شعر کی وہ خوبیاں جو بیان کے ساتھ مخصوص ہیں غزل سے فوت ہو گئیں مثلاً (۱) شاہزادہ رخصت مانگ رہا ہے ملکہ سے شوقؔ نے اس مقام کو یوں ادا کیا ہے ؎

منہ سے بولی نہ کچھ وہ غنچہ دہن
پاؤں سے پر دبا لیا دامن

یعنی شرم تو منہ سے بات نہ کرنے دی تو شوق نے پاؤں کی حرکت سے کام لیا اور شرم پر غالب آگیا (۲) ایا جیسے دو شاہزادے عون و محمدؑ شہادت کے شوق میں نکلے ہیں دونوں بھائیوں نے ساتھ ہی یزید کی فوج پر حملہ کر دیا ہے تلواریں مارتے ساتھ ساتھ بڑھے چلے جا رہے ہیں کہ دشمن کی فوجیں دونوں کے درمیان حائل ہوگئیں - اب بھائی سے بھائی جدا ہوگیا ہے اس مقام پر دونوں کے یکایک مل جانے کو میرانیس یوں فرماتے ہیں ؎

وہ شیر سا پہنچا جو ادھر یہ ادھر آیا
جان آگئی بھائی کو جو بھائی نظر آیا

یعنی قاتلوں کے نرغہ میں آجانے سے ایک کو ایک کی صورت دیکھنے سے یاس ہوگئی تھی (۳) یا مثلاً حر کی آمد میں فرماتے ہیں ؎

برچھیوں اڑ ملے ہے دب کے فرس نولوں سے
آنکھ لڑ جاتی ہے دریا کے نگہبانوں سے

گھوڑے کا اوڑنا اور دریا کا نظر آجانا یہ مضمون تو میر صاحب کا حد اعجاز کو پہنچ گیا ہے۔ اس کے علاوہ آنکھ لڑ جانے میں یہ معنی ادا کئے ہیں کہ تم نے پانی تو بند کیا ہے اب ہشیار ہو جاؤ میں آتا ہوں۔

غرض مسلسل مضمون میں ایسا سماں بندھ جاتا ہے کہ شاعر کو

ایسے موقع بھی مل جاتے ہیں کہ وہ دو لفظوں میں بہت سے معنے اور بہت سی باتوں کو ادا کر دے۔ غزل گو کو دو مصرعوں میں ایسا میدان کہاں مل سکتا ہے۔ اب ثابت ہو گیا کہ غزل گو شعر کی اس خوبی سے محروم رہتا ہے جسے طلسم یا سحر یا اعجاز کہنا چاہیئے اس میں شک نہیں کہ ایسا سماں باندھ دینا جس میں شاعر یہ جادو جگا سکے بڑے بڑے سخن سنجوں کو بھی شاذ و نادر نصیب ہوتا ہے لیکن غزل گو کے لئے تو ممکن ہی نہیں

آخر سیدھا رستہ چھوڑ کر

الٹی چال چلنے کا باعث کیا ہوا

سبب اس کا مشہور ہے کہ مبتدی اس قابل نہیں ہوتا کہ شاعرانہ مضمون سوچ کر نظم کر سکے آسانی کے لئے قافیہ و ردیف اسے بتائے جاتے ہیں۔ اب قافیہ کو ردیف کے ساتھ ربط دینے کے لئے اوسے مختصر سا مضمون سوچنا پڑتا ہے۔ جو دو مصرعوں میں تمام ہو جائے مثلاً فرہاد و بہزاد و صیاد قافیہ ہو تو وہی کوہ کن و مصوری و صید افگنی کا مضمون سامنے آئیگا۔

محمل و بسمل و منزل قافیہ ہو تو محمل لیلیٰ کی طرف اشارہ کرے گی بسمل قاتل کا پتہ بتائے گا اور منزل کے لئے تو جادہ پیش پا افتادہ ہی غزل گو کہے ہوئے مضمونوں کو بار بار کہتا ہے اور فخر اس بات پر

کرتا ہے کہ کہنہ مضامین کو ہر مرتبہ لباس نو میں ظاہر کرتا ہے۔ غزل کے ایجاد کا دوسرا سبب یہی معلوم ہوتا ہے کہ معانی کو نئی نئی صورتوں میں دکھانے کی مشق پیدا ہو جائے۔

اس قیاس کے صحیح ہونے کا بڑا قرینہ یہ ہے کہ جس زمانہ میں غزل ایجاد ہوئی ہے۔ اسی زمانہ میں فن بلاغت کی تدوین و تہذیب ہو رہی تھی۔

پہلے شیخ المعتزبہ جنہوں نے جو متوکل و معتصم عباسی کا معاصر تھا البیان والتبیین کے نام سے ایک مختصر سی کتاب شائع کی جو آجتک گویا درس میں جاری ہے۔

پھر امام عبدالقاہر جرجانی نے اسرار البلاغتہ لکھ کر آنکھوں پر سے پردے اٹھا دئے اور دلائل الاعجاز کی تالیف سے قرآن کے وجوہ بلاغت کو بے نقاب کر دیا۔

انھوں نے جو موتی اوگلے تھے وہ بکھرے ہوئے تھے علامہ سکاکی نے گوہر شاہوار چن کر ایسی ایسی لڑیاں گوندھیں کہ فن کی تہذیب و ترتیب اس سے بہتر ہو نہیں سکتی۔

پھر بھی بعض علماء نے سکاکی پر دقیق نظر ڈال کر متن کو زیادہ متین کر دیا۔ اسکی سیکڑوں نقلیں ہوئیں اور بلادِ اسلام میں جابجا درس

ہونے لگے۔

آخر میں فاضل تفتازاں نے بذل جہد کر کے اس متن متین پر شرحیں لکھ ڈالیں اور اسکے فیض کو عام کر دیا عرب سے لے کر ہندوستان و سمرقند سے لے کر جرجان تک معانی بیان کے درس جاری ہو گئے۔

اس فن کے پڑھنے سے اعجاز قرآن واضح ہوتا ہے اس سبب سے فن بلاغت جزو مذہب سمجھا گیا خاص کر کے فن بیان علمانے اس امر کی تعلیم کے لئے لکھا ہے کہ ایک معنی خاص کو متعدد طریقوں سے ادا کرنے کی صورتیں کیا کیا ہیں

مثلاً تشبیہ استعارہ مجاز کنایہ پھر ان میں سے ہر ایک کے اقسام گوناگوں ہیں

یعنی ایک معنی خاص کے ادا کرنے کے فن بیان میں سیکڑوں طریقے ہیں جب اس فن کی تعلیم کا رواج عالمگیر ہو رہا تھا اوسی زمانے میں غزل ایجاد ہوئی ہے یعنی جو پڑھیں اس کی مشق بھی کریں۔

سعدی کے زمانہ سے لے کر اس وقت تک غزل کے مضامین ایک ہی طرح کے چلے آتے ہیں اور بار بار کہے جاتے ہیں۔

یہ سب مضامین عامۃ الورود ہیں اس لئے کہ فطرۃ انسانی سب میں مشترک ہے ایک ہی طرح کے ولولے ایک ہی طرح کی امنگیں

ایک ہی قسم کے جذبے سب میں پائے جاتے ہیں مضمون کہاں سے الگ الگ آئیں گے۔ طرز بیان کا الگ الگ ہونا البتہ ضرور ہے کلام میں دو چیزیں دیکھی جاتی ہیں ایک تو اصل مضمون دوسرا طرز بیان۔ ان دونوں میں اصل مضمون کسی کا مال نہیں اس لئے کہ وہ ہر شخص کا مال ہے ہاں طرز بیان اپنا اپنا الگ ہونا چاہیئے ورنہ سرقہ کا الزام عاید ہوگا۔

طرزِ بیان ہی وہ چیز ہے جس کے لئے علمائے اسلام نے فنِ بیان کو ایجاد کیا اور غزل گویوں نے اس مشق کو حد اعجاز تک پہنچا دیا۔ لکھنؤ کا ایک شاعر زنار بند جس کا سارا کلام زمانے نے شاید تلف کر دیا ایک عارفانہ مطلع غزل کا چھوڑ گیا ہے جو دلوں پر لکھا ہوا ہے اور کبھی نہیں مٹنے کا ؎

چرخ کو کب یہ سلیقہ ہے ستمگاری میں
کوئی معشوق ہے اس پردۂ زنگاری میں

میرے کرمفرما نواب عبدالرحمن خاں شاطر نے اس بیت سے کیا اچھا استنباط کیا ہے ؎

بے محل پڑتا نہیں ہے ایک بھی تیرا قدم
کوئی ہے تجھ پر سوار اے ابلق لیل و نہار

اصل مضمون یہ ہے کہ حق تعالیٰ کا ہر کام مصلحۃ و حکمۃ پر مبنی ہوتا ہے

اس مضمون کے ادا کرنے کے دو پیرایے دونوں بیتوں سے ظاہر ہو رہے ہیں۔ اسے سرقہ نہیں کہہ سکتے سرقہ کہنے کے یہ معنی ہوتے ہیں کہ اس طرز ادا کو ترک کر دیا ہوتا

بلکہ بیدل کا یہ شعر ؎

چوں کاغذِ آتش زدہ جہان تقائیم
طاؤس پر افشانِ چمن زار فنائیم

غالب کے اس شعر سے بہت مشابہ ہے ؎

کفِ ہر خاک بہ گردون شدہ قمری پرواز
دام ہر کاغذ آتش زدہ طاؤس شکار

بیدل نے بے ثباتی عمر کے بیان میں کاغذ آتش زدہ کو طاؤس پر افشاں سے تشبیہ دی ہے غالب نے جوش بہار کے بیان میں اس کاغذ کو دام اور اس کے شعلہ کو طاؤس سے تشبیہ دی ہے دام و شکار کی نازک تفصیل نے مضمون ہی کو کچھ کا کچھ کر دیا اس زمانے کے مضمون نگاروں نے غالب کے کلام سے صدہا سرقے نکالے اور شائع کیے مگر وہ خود ہی نہیں سمجھے نہ سمجھیں گے۔

غور سے دیکھیے تو اسے بھی سرقہ نہیں کہہ سکتے۔

مجھے ناصر علی کے اس مصرع سے ع

تپد در آئینہ جوہر چو ذرہ در روزن

غالب کا یہ مصرع یقینی اخذ کیا ہوا معلوم ہوتا ہے ع

پر افشاں جوہر آئینہ میں جیسے ذرّے روزن میں

لیکن ذرّوں کا روزن میں پر افشاں ہونا تڑپنے سے کہیں بہتر معلوم ہوتا ہے

جلال اسیر کے اس شعر سے بھی ؎

جنوں بمستی و ہشیاری آزمود مرا

زبسکہ محو تو بودم زمن ربود مرا

دیکھیے مرزا غالب نے کیا خوب استنباط کیا ہے جو قابل وجد کرنے کے ہے ؎

نسیہ و نقد دو عالم کی حقیقت معلوم

لے لیا مجھ سے مری ہمت عالی نے مجھے

ان دو مصرعوں میں کیا کیا مضامین عالی نکل آتے ہیں۔ کہ حیرت ہوتی ہے۔ اسیر نے بھی تمثیل کہا تھا غالب نے اس پر بھی ترقی کی خیر یہ لوگ تو بڑے مرتبے کے ہیں نواب سیّد محمد خاں رند جو حقیقت میں رند ہی تھے ان کو دیکھیے اور اس شعر کو دیکھیے ؎

میں مسافر ہوں اتر جاؤنگا پار اک دم میں

تجھ کو اے موج مبارک رہے دریا تیرا

اسی مضمون کو خواجہ میر درد نے اس طرح کہا تھا ؎

گرتی ہے بوئے گل تو مرے ساتھ اختلاط پر آہ میں تو موج نسیم وزیدہ ہوں

اسی امید میں کہ شاید کوئی ایسا شعر نکل آئے عمر بھر فکر غزل نہیں چھٹتی اور تمام اصناف شعر چھوٹ جاتے ہیں۔

کبھی غزل گو دو مصرعوں میں ایسا مضمون باندھ جاتا ہے کہ وہ مسلسل نظموں میں اس برجستگی کے ساتھ نہیں بندھ سکتا نظیری کا یہ شعر لوگوں کے دلوں پر لکھا اور زبانوں پر جاری ہے۔

بوی یار من ازیں سست وفا می آید
گلم از دست بگیرید کہ از کار شدم

مرزا رفیع سودا نے اس سے یہ مضمون استباط کیا اور اساتذہ کا کلام دیکھنے سے یہی استنباط سب کو مقصود ہوا کرتا ہے ؎

کیفیت چشم اسکی مجھے یاد ہے سودا
ساغر کو مرے ہاتھ سے لینا کہ چلا میں

کوئی یہ نہ خیال کرے کہ میں سودا پر سرقہ کا الزام دھرتا ہوں ہرگز سرقہ نہیں یہ مضمون ہر ایک انسان کی فطرت میں داخل ہے جس زمانہ میں انگریزی کا مجھے شوق تھا اور گرے کی نظموں کا ترجمہ کر رہا تھا یہی مضمون ٹینیسن کے یہاں میں نے اس لباس میں دیکھا کہ "شگوفوں نے بے خودی میں اپنے عطر دانوں کا عطر لنڈھا دیا"

یہ بات وہم میں بھی نہیں آتی کہ نظیری کا یہ مضمون ٹینیسن تک پہنچا تھا

اسی مضمون کو مونس نے اس طرح باندھا ہے کہ مسدس کے ایک بند میں کربلا کی سرزمین کا ذکر کیا ہے جہاں بہار آئی ہوئی ہے۔ ع

بلبلیں پھول لئے پھرتی ہیں منقاروں میں

یہ مصرع پڑھ کر مجھے مرحوم کا یہ کہنا بھی یاد ہے کہ سب صاحب اس مصرع کو یاد رکھیں۔ اس کے بعد دوسرے بند میں بنی فاطمہ کے نونہالوں کا ذکر چار مصرعوں میں کیا ہے بیت یہ ہے ؎

انکی نکہت جو گذر جاتی ہے گلزاروں سے
بلبلیں پھول گرا دیتی ہیں منقاروں سے

آپ نے دیکھا کس قدر پھیلا کر اس مضمون کو مونس نے کہا کہ انہیں کہنا پڑا کہ سب صاحب اس مصرع کو یاد رکھیں۔

بادشاہ کے سبعہ سیارہ میں مرزا علی بہار مرحوم نے اسی مضمون کو سلام میں کیا خوب کہا ہے ؎

باغ میں بلح کی بیتیں جو مزا دیتی ہیں
ڈالیاں جھوم کے پھولوں کو گرا دیتی ہیں

جس مضمون کے لئے مونس مرحوم کو مسدس کے کئی بند کہنا پڑے نظیری و سودا و بہار نے دو ہی مصرعوں میں نظم کیا ہے۔

طولانی مضمون کو مختصر کرنے کی مشق غزل گو کو ہو جاتی ہے اور

ایسا ہونا بھی چاہئیے۔

(۱)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

(۱۵)

مفاعیلن چار بار

ترے جلوہ کے آگے اپنی ہستی کو فنا پایا
یہ پیغام اجل ہم نے دمِ قالوا بلیٰ پایا
کیا پائے طلب کو قطع تو دستِ دُعا پایا
خدائی بھر سے ہم نے ہاتھ کھینچا تو خدا پایا
رگِ گردن سے اقرب آسماں کے ماورا پایا
نہ پہچانا کبھی ہم نے اوسے اور بارہا پایا
نفس کو شہر خاموشاں کا ہم نے رہگرا پایا
رہِ بے نقشِ پا و کاروانِ بے درا پایا
تعلق ایک نعمت کو ہزاروں نعمتوں سے ہے
تری درگاہ سے جتنا ملا اس سے سوا پایا

تعلق ایک حسرت کو ہزاروں حسرتوں سی ہے
دلِ بے آرزو پایا تو سمجھو مدعا پایا

خدا اگر ہمت عالی بھی دے اور خاکساری بھی
سمجھنا چاہیے بس حاصلِ ارض و سما پایا

نہ اب پست و بلند دہر کو مڑ کر بھی دیکھوں گا
بہت گر پڑ کے میں نے جادہ صبر و رضا پایا

گدائی کا ملا تھا ٹھیکرا جو درسے ساقی کے
اسی کو بزم جم میں ساغر گیتی نما پایا

خوشی کیا سال نو کی غافلو اس دار فانی میں
یہ سوچو تو بھلا اک سال کھویا تم نے یا پایا

بھروسا زیست پر کچھ ہے نہ ایام جوانی پر
شرار سنگ اسے دیکھا اسے رنگ حنا پایا

جسے ہو دید کی حسرت سنبھلنا اسکا مشکل ہے
کلیم اللہ نے بھی مثل نرگس کے عصا پایا

چلی ہے سل کچھ آزردہ چیں بر جبیں ہو کر
گدا کے گھر میں گیہوں آئی تھی جو اک بوریا پایا

نہ سمجھے آبلہ پائی کو میری قافلے والے

نمک افشاں کوئی پایا بھی تو شور ورا… پایا
زمینِ شعر پر اے نظمؔ ہم بھی شب کو گزرے تھے
اٹھا لائے ہیں دامن میں اسے جو کچھ پڑا پایا

(۹)

(۲)

کلامِ حق ہے تو رویت اب مجھے یہ اعتبار آیا
خبر موسیٰ نے جسکی دی تھی وہ ناقہ سوار آیا
وہ اس وادی کے گرم و سرد و خشک و تر کو کیا جانے
جو مثلِ باد گزرا اور مانندِ شرار آیا
مدارِ آسماں کو تنگ سمجھا میری ہمت نے
میں اک فتراک کے حلقہ میں عمر اپنی گزار آیا
تعالی اللہ اک دانہ میں یہ تفصیل مضمر تھی
کھلے گل کونپلیں پھوٹیں شگوفے نکلے بار آیا
یہاں جلوے بہت ہیں اور مہلت دید کی کم ہے
ہزار آنکھوں سے میں اس بزم میں مثلِ شرار آیا
جہاں میں چند دن مہماں ہے ہر فردِ بشر لیکن
وہ مہماں کیا ہے کہ جو لباسِ مستعار آیا
زنِ دنیا نے گو غازہ کشی کی دل لبھانے کو

مگر اب بھی تو عارض پر نہ رنگ اعتبار آیا
محبّت لالہ وگل کی جو تھی دل میں وہ کام آئی
پرِ طاوس پر آخر وہی نقش و نگار... آیا
گناہوں سے نہیں مہلت درِ توبہ پہ جانے کی
پکارا کرتی ہے رحمت کوئی اُمیدوار آیا

(۱۵) ۳

جہاں کو مژدہ اس جانِ جہاں کی آمد آمد کا
قیامت مصرعِ ثانی ہے جس کے مصرعِ قد کا
ہوئے افلاک پیدا نام جب آیا محمّدؐ کا
طلسمِ عالمِ امکاں تھا یا رب قفلِ ابجد کا
مواعظ کے گُہر عالم میں بکھرانے کو نور اسکا
اُبھر آیا ہے غوطہ مار کر دریائے سرمد کا
زباں سے گو نہیں کہتے ہمیں تھا انتظار اسکا
گواہی دے رہا ہے دل ہر اک قسّیس و موبد کا
کسی میں ہے کہ عالم کا تسلّی دینے والا ہے
کسی انجیل میں لکھا ہوا ہے نام احمدؐ کا

(دو انگلیاں اٹھا کر رسول اللہؐ نے فرمایا تھا انا والساعۃ کہتا تین ۱۲
(لغت میں موبد اور موبِد دونوں طرح آیا ہے ۱۲)

تری رفتار میں بیشک ہے اعجازِ مسیحائی
ہما بن کر فلک پر اڑ گیا سایہ ترے قد کا

براق تیز تگ جب طارمِ افلاک سے گزرا
تو مثلِ گردِ رنگ اڑنے لگا چرخِ زبرجد کا

تجھے معراج کی رفعت ہی فرش خاک پر حاصل
سرِ عرشِ اعلیٰ تکیہ ہے تیری مسند کا

تجھی سے عالمِ اسرارِ علمِ کن فکاں ہے تو
سبق روح القدس مکتب میں جب پڑھتے تھے ابجد کا

دعا مقبول ہو جاتی ہے تیرا نام لینے سے
ملا بندوں کو موقع حق تعالیٰ کی خوشامد کا

ﷲ اکبر کیا صلہ تیرے نواسوں کو
کہ ان کا قصر ہے یاقوت کا ان کا زمرد کا

سیر فرش تا عرش اک قلم مرکب کا ہے تیرے
مقامِ قاب قوسین ایک گوشہ تیری مسند کا

تعالیٰ اللہ ہے اس شاہ کی شانِ کرم ایسی
بھرم کھلنے نہیں پاتا منافق کی خوشامد کا

لہ رسول اللہ منافقوں میں گھرے ہوئے تھے اور سب سے مدارا کرتے تھے ۱۲

نہ چھوڑے گا درِ حیدر کو اب نظمِ ثنا گستر
یہی در ہے رسول اللہ کے شہرِ علم بے حد کا
کہاں ہے کعب سیکھے ہم سے آئینِ ثنا خوانی
کہ نعتِ مصطفےٰ اور ذکرِ شمشیرِ مہند کا

(۱۴)

نظر آتا ہے ابر آسا گذرنا کوہساروں کا
کہ عالم عالمِ اجسام میں ہے بے قراروں کا
کیا ہے دستگیری کا جو وعدہ اسکی رحمت نے
کلیجا ہاتھ بھر کا ہو گیا امیدواروں کا
گلستاں ہو کہ خارستاں ہو دونوں جائے عبرت ہیں
یہ مقتل نیزہ بازوں کا وہ مقتل تاجداروں کا
نہیں ہے شرک سجدہ کی جہت مشرق ہو یا مغرب
سمجھتا ہو اگر تو اک مرجع سب اشاروں کا
کرم ادنیٰ یہ اعلیٰ سے زیادہ ہے تعالی اللہ
گلوں سے پیشتر نشو و نما ہوتا ہے خاروں کا

۱ فتح مکہ کے روز کعب نے جو قصیدہ آنحضرت کے سامنے پڑھا تھا اس میں رسول اللہ کی نسبت سیف من سیوف الہند کا لفظ تھا آنحضرت نے اصلاح دی کہ سیف من سیوف اللہ

نہ شوخی اے صبا کر وضع میں اب فرق آتا ہی
غبار راہ اونچا نہ ہو جائے کہیں ہم خاکساروں کا
ضلالت میں گھرے ہیں اور علائق مانع عرفاں
شب تاریک ہے اور کاٹنا ہی کوہساروں کا
بہت جلدی کی تو نے کوس رحلت کے بجا ہمیں
کہ میں نے ای اجل ماتم نہ دیکھا دوستداروں کا
شرار و برق کی فرصت سی کم ہی فرصت ہستی
کہ سیکھا ہے سمند عمر نے بھرنا تراروں کا
ہوا میں ان کے ذری ہوں تو ہوں جو نامور گزرے
پتہ روئے زمیں پر تو نہیں ملتا مزاروں کا
بہانہ ڈھونڈھتی ہی اس کی رحمت تو یہ کیا جانے
گنہ ہے گردن مینا پہ واعظ بادہ خواروں کا
کہوں میں کیوں اسے عقد گہر پہنے ہوئے دیکھا
نظر آیا مجھے خورشید پر جھرمٹ ستاروں کا
کھلا رہتی ہے کیا سرمہ نگاہ سرمگیں تیری
کہ اف کرتا نہیں مارا ہوا تیرے اشاروں کا
منجم بھی ہے کیا اے نظم ہم فرقت نصیبوں میں

(۱۹) یہ اس کا جاگنا راتوں کا یہ گننا ستاروں کا (۵)

جفا و جور کی حد ہو گئی سمجھیں گے ہم اچھا
ستائے جاؤ تم اچھا کئے جاؤ ستم اچھا
اجل بھی دیکھ کر آفت میں کر جاتی ہے رم اچھا
بھلا کب تک چھپائیگی یہ منہ دیکھیں گے ہم اچھا
مجھے دوڑا رہا ہے شوق منزل کا یہ کہہ کہہ کر
کہ گرنا بار بار اچھا ہے - اٹھنا دم بدم اچھا
دل مضطر کو میرے چھوڑ کر مشق جفا کیسی
یہ کافر تیر کے قابل ہے یا صید حرم اچھا
چھپایا اس نے منزل کو بتایا راستہ اس نے
غبار رہ برا ٹھہرا رہا نقش قدم اچھا
رہے گبر و مسلماں منزل مقصد سے بیگانہ
ملا اس راہ میں ہنگامہ دیر و حرم اچھا
بگڑنا قہر تیرا مہرباں ہونا ہے ایک آفت
یہ انداز کرم اچھا ہے یہ طرز ستم اچھا
نہ دیکھ انداز آئینہ میں اپنا پوچھ لے مجھ سے

زمانہ بھر سے اچھا اور ترے سر کی قسم اچھا
جواب صاف دیکر توڑتے کیوں ہو مری دل کو
مجھے لیت ولعل اچھی مجھے لاو نعم اچھا
مقام شکر ہے جو کچھ دیا جتنا دیا اس نے
مقدر میں نہیں ہرگز خیال بیش و کم اچھا
نہ کھوئی اپنی عزت کاسہ لیس اغنیا ہو کر
کبھی جام سفالیں سے نہ سمجھے جام جم اچھا
نفس وزدیدہ جانا خوابگاہ میں حسینوں کی
نکالا سیر کا وقت اے نسیم صبح دم اچھا
کوئی پوچھے ذرا وارفتگان حسن سے اُس کے
وفا ہے یا جفا اچھی کرم ہے یا ستم اچھا
ورانمازوں کو سمجھائے کوئی للہ پوچھے تو
ملال آپس کا اچھا ل کے یا رہنا بہم اچھا
مناتا ہے ہر اک اپنی قدح کی خیر عالم میں
سمجھتے ہیں کہ سب سے آپ اچھے اپنا دم اچھا
اگر ایسا ہی پر آشوب ہے ہنگامۂ ہستی
تو پھر شہر خموشاں خوب ہے ملک عدم اچھا

لحاظ اتنا ابھی تک حضرت ناصح کا باقی ہے
وہ جو کچھ حکم فرماتے ہیں کہہ دیتے ہیں ہم اچھا
تہ پایا شعر ہم نے دفتروں میں اور سب کچھ ہے
زباں اچھی مضامیں خوب ہاتھ اچھا قلم اچھا
روانی کو کلام نظم کی انصاف سے دیکھیں
تو کھل جائے کہ ہے تلوار اچھی یا قلم اچھا

(۱۵)

(۶)

کہاں تک راستہ دیکھا کریں ہم برق خرمن کا
لگا کر آگ دیکھیں گے تماشا اب نشیمن.. کا
گلستاں میں بھی کیا تم آتش افروزی کو آئے تھے
لگا ہے ہوا میں اگ اڑکر رنگ گلشن کا
جو نازاں مردم آزاری پہ ہو اسکو یہ دو مژدہ
اجارہ چونٹیوں کو مل گیا گور تہمتن... کا
جنازہ جس گھڑی پہنچا لب مرقد تو ہم سمجھے
ذرا بھی فاصلہ دیکھا نہ گہوارہ سے مدفن کا
نہیں ہے کار فرما رنج و راحت کا سوا اسکے
مری آنکھوں پہ سر پر شکر و شکوہ دوست دشمن کا

مسیحا و خضر کیا جانیں لذت کو شہادت کی
نہ دیکھی خون کی ندی نہ چشمہ آب آہن کا

نہ پوچھو دل فلک کے حادثہ سے کسطرح ٹوٹا
یہ شیشہ تھا نشانہ ہو گیا سنگ فلاخن کا

یہ کیا باعث کہ لب تک جان آ آ کر پلٹ جائے
اجل بھی کچھ اشارہ پا گئی اس چشم پرفن کا

خبر اس کی نہ تھی یہ بھی خلاف طبع گزرے گا
گلا کاٹا تھا ہم نے دیکھ کر انداز چتون کا

لئے جاتے ہیں کیا کیا حسرتیں ہم کوے قاتل سے
جنازہ اٹھتے اٹھتے ہو گیا ہے سینکڑوں من کا

وہ دیکھو صف کی صف بسمل ہوئی جسکی لگاہوں نے
کوئی میری طرف منہ پھیرے اس ناوک افگن کا

گریباں میرا تیرا دیکھنا اک ہاتھ میں ہو گا
کہے دیتا ہوں میں ناصح مزاج اپنا ہی الجھن کا

کیا تو قید لیکن یاد رکھنا چارہ گر یہ بھی
کہ توڑا ہو گا چوڑی کی طرح سے طوق آہن کا

سنیں اس بلتباں سے ہم نے باتیں مجھ سے ناصح نے

ہوا یہ سلسلہ اپنی احادیثِ معنعن۔۔ کا
وطن کا حال پوچھا اے نظمؔ تو سیلِ حوادث سے
ملے بجلی تو پوچھوں میں نشاں اپنے نشیمن کا

(۱۲) (۷)

تجمل دیکھ کر تیرے شہیدانِ محبت کا
مسیحا و خضر پڑھنے لگے کلمہ شہادت کا
مرے دل سے اگر نکلا شرارہ سوزِ فرقت کا
خدا معلوم ہو کیا حشر خورشیدِ قیامت کا
مسیحا سے مداوا کیا ہو تیرے سوزِ فرقت کا
رہا مہرِ درخشاں کو بخار اور کیسی شدت کا
فرشتہ تو نہیں ہے پاکدامن ہو تو کیونکر ہو
کہ دل رکھتا ہے انساں اور دل بھی ایک آفت کا
نہ پوچھو دورِ گردوں میں حلاوت زندگانی کی
کہ اپنا خون پیتے ہیں مزا لے کے شربت کا
سلایا اس نے جب چاہا جگایا اس نے جب چاہا
ہمارے اور اس کے بیچ میں پردہ تھا غفلت کا
ذرا سن تو سہی کیا شور ہے شہرِ خموشاں میں

جو عاقل ہیں یہاں آ کر سبق لیتے ہیں عبرت کا
شباب اس طرح سے تجزا کہ اب معلوم ہوتا ہی
وہ باتیں اک زمانہ کی ہیں قصّہ ایک مدّت کا
خغانِ آبشار و اشک ابر و گریۂ شبنم
جدھر دیکھو ادھر رونا ہی اپنی اپنی قسمت کا
جو چھپ چھپ کر نہ روؤں راز پنہاں رہ نہیں سکتا
کہ میرے آنسوؤں میں رنگ ہی میری طبیعت کا
نہیں ہرگز مجالِ دم زدن آئینہ خانہ میں
ہے اس محفل میں ہنگامہ دو صد آئینہ حیرت کا
دل آزاری کی عالم میں ہوا چلتی ہی ای حیدرؔ
بگولے رقص کرتے ہیں مٹا کر نقش تربت کا

(۸) (۸)

سوا جلوہ کے تیرے اور میرے دل میں کیا ہوتا
سمجھتا اس کو بیت خانہ جو نقش ما سوا ہوتا
تجھے یکتا سمجھ کر ناز یکتائی اٹھاتا ہوں
وگرنہ میں بتا دیتا جو کوئی دوسرا ہوتا
کسی کا ذکر کرکے اس قدر لی چٹکیاں ہم نے

گلِ خود رو چمن میں ہنستے ہنستے رو دیا ہوتا
کیا تھا جس نے زانو مسندِ الفقرُ فخری پر
نہ کیوں نقشِ سلیماں اس کا نقشِ بوریا ہوتا
نہیں اٹھ سکتا مجھ سے جنبشِ مژگاں کا صدمہ بھی
کہ تو نے آنکھ پھیری میں نظر سے گر گیا ہوتا
وہ برہم ہو گئے زلفیں ذرا رخ سے جو سرکائیں
خطا گر اور کچھ ہوتی نہیں معلوم کیا ہوتا
مرے باعث سے عالم میں ہوا مشہور تو ورنہ
یہ شہرے ہر جگہ ہوتے یہ چرچا جا بجا ہوتا
تھکا مارا تلاشِ منزلِ مقصد کا ہوں حیدرؔ
قدم پر اس کے سر رکھتا جو کوئی رہنما ہوتا

(۱۷) (۹)

مٹا دی اس نے ہستی آستینوں کو اگر الٹا
عدم کا اٹھ گیا پردہ جو دامن تا کمر الٹا
نگاہِ ناز آئینہ میں رکھتی ہے اثر الٹا
ادھر دیکھو قیامت ہو گی یہ جادو اگر الٹا
بہار آئی اٹھے بادل چلے صحرا کو دیوانے

ہوئی الجھن بڑا آزار دل الٹا جگر الٹا

نہ بھولیں گی کبھی وہ خلوتیں وہ عیش کی راتیں
کہ پردہ شام سے چھوڑا تو ہنگام سحر الٹا

موذن نے اذاں مغرب کی دی صبح شب فرقت
بجائیں نوبتی نے وردیاں الٹی گجر.. الٹا

وہ بل کھا کر اٹھے ہیں قتل کرنے کو پڑوں تا ہوں
مجھی پر کچھ نہ کچھ الزام دھر دیگی کمر الٹا

صبا کی شوخیوں پر رشک کیسا مجھکو آتا ہے
کہ آنچل اس کا یوں سوتے میں بےخوف و خطر الٹا

جواب آیا نہ مرغان چمن سے میرے نالوں کا
گلے کو کس قدر پھیرا زباں کو کس قدر الٹا

وہ آئینہ جو میری آنکھ سے دیکھیں تو بتلا دوں
کلیجہ تھام لیں بلکہ کرے تیر نظر الٹا

کسی نے آکے آنسو بھی نہ پونچھے ہجر کی شب میں
نسیم صبح نے منہ سے مرے دامان تر الٹا

گلی میں اس ستمگر کی نہ جائے لاش بھی میری
بہا دینا مجھے اے سیل اشک چشم تر الٹا

زباں منہ میں حریفِ کینہ جو کے ہے کہ بچھو ہے
نہ اک سیدھی سی بات اس کی نہ اس کا نیشتر الٹا

بہارِ باغ دونی ہو گئی ہے مینہ برسنے سے
نظر آنے لگا ہر ایک تھالے میں شجر الٹا

لبِ دریا تماشا انقلابِ دہر کا دیکھو
کہ پانی دوپہر بہتا ہے سیدھا دوپہر الٹا

براق اس طرح روز و شب کی حد سے ہو گیا باہر
نظر آنے لگا مہرِ مبیں سیدھا قمر الٹا

جلے ہیں غیر کیا کیا وہ جو خلوت سے مری نکلے
پریشاں باندھ کر گیسو دوپٹا اوڑھ کر الٹا

جو ہو سچ بات وہ انظمؔ دو پہلو نہیں رکھتی
نظر آتا ہی یکساں رکھیے سیدھا یا گہر الٹا

(۱۰) (۱۹)

صواب اپنی خطا کو اپنے عیبوں کو ہنر جانا
زہے گم کردہ منزل رہ زنوں کو راہ بر جانا

ہمیشہ ہمتِ عالی کو اپنا راہبر جانا
اسی رستے چلا جس راستہ کو پر خطر جانا

گلا گھونٹا ہے میرا تو نے کیوں او خوفِ رسوائی
شکستِ رنگ کے نغمہ کو بھی کیا شورِ محشر جانا

یہ میری سادگی اے عمرِ رفتہ میری نادانی
کہ تجھ کو ہم رکاب و ہم عناں و ہم سفر جانا

لیا ہے میں نے مُلکِ خاکساری کو تواضع سے
اسی انداز سے جھکنے کو شمشیرِ کمر جانا

شعاعِ رنگ کو سرگم میں سمجھا سازِ ہستی کی
تماشائے جہاں کو نغمہ تارِ نظر جانا[۱]

یہ کس دھوکے میں جان اپنی دے دیتے ہیں پروانے
انہوں نے شمع کے شعلہ کو شاید گنج زر جانا

تو راہی آبرو جو قطرہ شبنم سے بھی کم تھی
سُنا جوہر شناسوں نے اسے آبِ گہر جانا

مصائب بھی جہاں کی بے ثباتی ایسے نظر آئے
کہ میں نے آفتابِ حشر کو شمعِ سحر جانا

مجھے وارفتگی پرزشتہ عرفاں کا تھا دھوکا
جسے تجھ سے بے خبر دیکھا اوسی کو باخبر جانا

[۱] سرگم کے سات سُر جس طرح ساز سے نکلتے ہیں اسی طرح شعاع کے سلفتہ رنگ تارِ نظر پر ہوتے ہیں!!

نہ کام آئی ہماری عقل تو کیا تیرے ہم لوہ کو
باندازِ دگر دیکھا بہ عنوانِ دگر جانا

بنایا رنج و راحت کو جو توام میرے خالق نے
انہیں دو نعمتوں کو میں نے بھی شیر و شکر جانا

خزانہ سے کہیں بڑھ کر ہے استغنا طبیعت کا
کہ پایا کم سے کم تو بیشتر سے بیشتر جانا

ضرر پہنچا نہ مجھ کو آن کر اس بھڑ کے چھتے میں
کہ میں نے نوش کو بھی نیش بلکہ نیشتر جانا

دکھائے چاند رخساروں پہ چھالوں نے جو گھونگر کے
منجم نے اسی کو فتنۂ دورِ قمر جانا

فنا کی منزلوں میں ساتھ کافور و کفن بھی تھا
اسے رختِ سفر سمجھا اسے گردِ سفر جانا

جہاں میں اس طرح سے اپنی زیرِ آسماں گزری
کہ اس کو رہگذر۔ اس کو غبارِ رہگذر جانا

روانی عمر کی دیکھی کبھی گردش ستاروں کی
تبسم برق کا اس کو اسے رقصِ شرر جانا

شل ہے نظم جو سویا وہ کھویا حسبِ حال اپنے

(١١) شب قدر آج ہی تھی ہم نے یہ وقتِ سحر جانا (١١)

ادائیں سادگی میں کنگھی چوٹی نے خلل ڈالا
شکن ماتھے پہ ابرو میں گرہ گیسو میں بل ڈالا
کھلے دو پھول نیلوفر کے آنکھیں اس نے جب کھولیں
ستم کیسا کیا شرما کے ہاتھوں سے جو مل ڈالا
نہ اگلی سی محبت ہے نہ اگلی سی مروت ہے
الٰہی خیر وہ انداز ہی اب تو بدل ڈالا
تمہاری بزم میں آ کر نہ کچھ کہتے بنی ہم کو
گلا نالہ نے گھونٹا منہ شکایت نے مسل ڈالا
فلک کو دیکھ کر شکوہ کریں ہم یہ ارادہ تھا
کہا جھک کر فلک نے سر اٹھایا اور کچل ڈالا
جدا ہے پاؤں سے زنجیر پتھر دور ہے سر سے
رفیقانِ کہن میں تفرقہ خوب اے اجل ڈالا
نہ یہ دیکھا فلک نے کون سرکش کون ہے عاجز
گیہوں کے ساتھ اس نے آسیا میں گھن بھی دل ڈالا
شکن ماتھے پہ آئی اب بھلا کیوں رخ لگے کرنے

تعلّی بڑھ گئی موباف جو پہلے پہل ڈالا

موذّن کی خوش آہنگی بے ہنگام تو دیکھو
شبِ عشرت میں ان حضرت نے ناحق کو خلل ڈالا

بنایا غیر کو اس نے نشانہ اپنے پیکاں کا
کسی نے چاہنے والے کا دل چٹکی سے مل ڈالا

علائق میں پھنسا کیوں جلوہ گاہ قدس سے آکر
بتا اے نظمؔ آخر بھیس کیوں تو نے بدل ڈالا

(٢٠) (١٣)

مفاعیلن مفاعیلن مفاعیل

وہ دیکھو روند کر مدفن کسی کا — چھلاوا بن گیا توسن کسی کا

نہ کرنا منّت شکار افگن کسی کا — نہ رکھنا تسمۂ گردن کسی کا

وہ آنا پھیر کر چتون کسی کا — وہ سر پر گوشۂ دامن کسی کا

نگہ ہنگامہ برہم زن کسی کی — تبسّم صاعقہ افگن کسی کا

چھری پھیریں گے یہ ابرو کسی کے — کرے گی خون یہ چتون کسی کا

اٹھے اس رہ میں صدہا گرد ہوکر — نہ پہونچا ہاتھ تا دامن کسی کا

ستاروں کا بچھونا کہکشاں ہے — گیا ہے لوٹتا دامن کسی کا

کسی کے قبر پر کیوں کھینچی رشک — سرا ہے یہ نہیں مسکن کسی کا

دیا دو گز کفن گردوں نے وہ بھی — ڈھکا جس سے نہ دو دن تن کسی کا
کوئی ہے کینہ جو اپنے لئے ہے — تجھے کیا تو نہ ہو دشمن کسی کا
نہ پوچھو فاتحہ پڑھنے کا انداز — وہ نازک ہاتھ اور مدفن کسی کا
غبار کارواں بیخودی ہوں — نہ رہبر ہوں نہ میں رہزن کسی کا
چڑھوں میں عرش پر کیوں ہاتھ چھکا ہے — لیا قرب رگ گردن کسی کا
گنہ کوئی کرے ملزم میں ٹھہروں — کسی سے دل نہ ہو بدظن کسی کا
درازی زلف کی ہے روز افزوں — لہو پیتی ہے یہ ناگن کسی کا
مجھے چاک قبائے گل نے مارا — یونہیں نکلا تھا پیراہن کسی کا
دکھایا میں نے آئینہ تو بولے — ستم ہے آج تو جوبن کسی کا
زوال حسن پر ہے لوچ باقی — ڈھلا سانچے میں ہے جوبن کسی کا
زہے رحمت پسند آئی جو اس کو — ہر سجدہ خم گردن کسی کا

زخود رفتہ ہی بجلی آج اے نظم
اسے کیا مل گیا خرمن کسی کا

(۱۳) (۱۳)

فعولن فعولن فعولن فعول

بڑے معرکے سے ہے آیا ہوا — لہو میں ہے آنسو نہایا ہوا
گہر ہے کہ صبح بناگوش میں — ستارہ سحر جھلملایا ہوا

وہ عیّار نظروں سے اوجھل بھی ہے | پھر آنکھوں میں بھی ہے سمایا ہوا
نہ پھیر تو مجھ سے تو اے نازنیں | کہ میں ہوں فلک کا ستایا ہوا
سزاوار رحمت ہوں میں اے کریم | کہ آیا ہوں تیرا بلایا... ہوا
غضب کی تھی میدان محشر میں دھوپ | گنہوں کی ظلمت سے سایا ہوا
نظر جب سے آئی ہے زلفِ سیاہ | اندھیرا ہے آنکھوں میں چھایا ہوا
جنوں سر پہ جن کی طرح ہے سوار | اجل کی طرح دل پہ آیا ہوا
خوشی میں نے تیری بہر حال کی | خفا مجھ سے اپنا پرایا ہوا
رہائی خودی سے نہ ممکن ہوئی | یہ پہرا ہے کس کا بٹھایا ہوا
چمکتا ہے ایسا وہ کندن سا رنگ | کہ سونا ہو جیسے گلایا ہوا
چھڑکتے ہیں وہ اس ادا سے گلاب | کہ جاتا ہے ہوش آیا ہوا

میری نظم کا ہے دلوں پر اثر
یہ سکہ ہے اپنا بٹھایا ہوا

(۱۸)

(۱۹)

فاعلاتن فاعلاتن فاعلاتن فاعلات

ایک سے ایک اُس قدر افگن کا احساں بڑھ گیا
تیر سے دل بڑھ گیا پھر دل سے پیکاں بڑھ گیا
لے کے مشتاقوں کو شوقِ بزمِ جاناں بڑھ گیا

مضطرب سی مضطرب حیراں سے حیراں بڑھ گیا
بڑھتے بڑھتے کس قدر طومار عصیاں بڑھ گیا
چند دفتر قصۂ خواب پریشاں بڑھ گیا

سر ندامت سے جھکانے کا بھی موقع اب نہیں
گھٹنوں گھٹنوں تھا جو پانی تا گریباں بڑھ گیا

کچھ تلاطم میں تھی خود بھی کشتیٔ عمر رواں
دل کے پیہم دھڑکنے سی بھی طوفاں بڑھ گیا

روز کی بیداد اے چرخ اور اک عالم کی آہ
دیکھنا اک دن چراغِ مہرِ تاباں بڑھ گیا

سامنے دونوں کے تھا میداں ہوائے وصل کا
رہ گئی پیچھے تمنا درد ہجراں بڑھ گیا

دیدہ خورشید صبح و شام ہو جاتا ہے سرخ
کس قدر اس عہد میں آشوبِ دوراں بڑھ گیا

آرزو یہ تھی کہ آجائے گلے میں تیرے ٹھیک
ایک ہی شب میں مہ نو کا گریباں بڑھ گیا

یہ تو چکی بار بار آنکھیں سے ڈھونڈا کریں
برق سے بھی غمزہ عمر گریزاں بڑھ گیا

نعمتِ خلت کا جب سے ذوق میرے دل کو ہے
خوانِ ابراہیم پر اک اور مہماں بڑھ گیا

تیرا شیوہ دل فریبی کا بہت مشہور تھا
جاں ستانی کا بھی اب تو ساز و ساماں بڑھ گیا

اہلِ کشتی کو مسرت ہے چلی بادِ مراد
نامرادی کہہ رہی ہے اور طوفاں بڑھ گیا

ہو گا خود ساماں پیدا چاہیئے کچھ دل میں جوش
شورشِ فرہاد سے بر چھوں نیستاں بڑھ گیا

سچ یہ ہے جس روز بسم اللہ مکتب میں ہوئی
دودھ تیرا اس دن اے طفلِ دبستاں بڑھ گیا

تھا یہ کس کی قبر کا سبزہ کہ جس کو دیکھ کر
پاؤں پھیلائے ہیں دامن سے گریباں بڑھ گیا

عہدِ پیری میں ہوا روشن بیانی کو فروغ
صبح ہوتے جلوۂ شمعِ فروزاں بڑھ گیا

ابنِ مریم ایک ہی ٹھوکر لگا کر رہ گئے
سو قدم ان سے مرا عیسیٰ دوراں بڑھ گیا

یا نہ ہرائے نظم مصرع ناسخ مغفور کا

سو چمن آگے مرا سروِ خراماں بڑھ گیا

(11) (15)

ساقیا خالی نہ جائے ابر یہ آیا ہوا
ہو رہے ہیں سرخ شیشے دل ہے للچایا ہوا

داغِ دل چمکا جو اُن کے طالبِ دیدار کا
جھلملاتا ہے چراغِ طور شرمایا ہوا

عاشقوں کو ڈھونڈتے پھرتے ہو کیا محشر میں بھی
دھوپ میں پھرنے سے ہے کچھ رنگ سونلایا ہوا

دل بھی ٹوٹا بلبلِ ناشاد کا پھولوں کے ساتھ
دامنِ گلچیں میں اک غنچہ ہے کمھلایا ہوا

کشمکش میں آرزوئے قتل نکلے کس طرح
مضطرب میں بھی ہوں قاتل بھی ہے گھبرایا ہوا

آج پھر ناصح وہی چلتا ہوا فقرہ کہا
بارہا کا جو کہ ہے ارشاد فرمایا ہوا

دیکھے تسکیں اس نے اعجازِ مسیحائی کیا
رہ گیا قالب میں دم ہونٹوں تلک آیا ہوا

بام پر وہ جلوہ فرما ہے مقابل کون ہو

چاند کچھ دب دب کے نکلا بھی تو شرمایا ہوا
سرو و سنبل دیکھتے ہی خاک میں مل جائیں گے
بال یہ بکھرے ہوئے چلنا یہ اٹھلایا . . . ہوا
ابر تو آیا بھی ساقی اور برس کر کھل گیا
میری آنکھوں میں اندھیرا رہ گیا چھایا ہوا
کل تلک منہ ڈھانک کر سونے میں دم گھٹتا تھا نظم
آج دامانِ کفن منہ پر ہے دُہرایا ہوا

(۲۱) (۱۶)

بسکہ سیلابِ فنا دارِ محن ثابت . . ہوا
بلبلہ پانی کا یہ چرخِ کہن ثابت ہوا
نقشِ باطل جب خیالِ ما و من ثابت ہوا
دھر میں انسان آوارہ وطن ثابت ہوا
کہتی ہیں تیری نگاہیں تجھ پہ خونِ بے گناہ
او قدر انداز او ناوک فگن ثابت ہوا
جب ہوا چلتی ہے نرگس کی جھپک جاتی ہے آنکھ
برق خاطف شعلہ رنگِ چمن ثابت ہوا
منہ چھپا لینے کا ساماں ہو گیا محشر میں بھی

یوں اُڑی رنگت کہ دامانِ کفن ثابت ہوا

رات کو یہ وہم تھا ہے عارضِ روشن پہ نیل
صبح کو وہ نقش برگِ یاسمن ثابت ہوا

سمجھے تھے دلدار و دلسوز و دلآرام اُس کو حیف
دلفریب و دل ربا و دل شکن ثابت ہوا

دل میں تیرے تو لگا کر تیغ ٹھنڈک پڑ گئی
کچھ گنہ میرا نہ اے شمشیر زن ثابت ہوا

اب کے ہی فصلِ جنوں میں ناتوانی اس قدر
پیرہن اپنا نہ اپنا پیرہن ثابت ہوا

ہم تو جینے ہی کو سمجھے تھے کہ مشکل ہے بہت
جان دینا بھی نہایت ہی کٹھن ثابت ہوا

دوش پر بکھرے جو گیسو یہ پھڑک کر رہ گیا
دل اسیرِ دامِ زلفِ پر شکن ثابت ہوا

سُرخ اس کافر کی پیشانی پہ قشقہ کھینچ کر
خون گردن پر ہی اُسے برہمن ثابت ہوا

جی گیا آتے سے اس کے مر گیا جانے سے میں
مجھ میں اس میں ارتباطِ جان و تن ثابت ہوا

اس جہاں میں لوگ کہتے ہیں کہ تن ثابت نہیں
میں یہ کہتا ہوں کب اُس عالم میں تن ثابت ہوا

سختیاں جھیلے نہ کیوں انسان دنیا کے لئے
کوہکن پر کب فریب پیرزن ثابت ہوا

شوق میں اس جلوہ گہ کے مہر عالمتاب بھی
مثل اک ذرہ کے آوارہ وطن ثابت ہوا

زلف و قد کا تھا جو سودا خون ہو ہو کر بہا
دل ہمارا کشتہ دار و رسن ثابت ہوا

جھک پڑی چہرے پہ لہرا کر جو زلفِ پر شکن
شاخ سنبل کا ثمر سیب ذقن ثابت ہوا

قہر ڈھایا جب اٹھا مظلوم کے دل سے دھواں
ایک مور ناتواں بھی پیل تن ثابت ہوا

سر پہ تیشہ طرہ خسرو کا دیتا ہے جواب
آج اے فرہاد تیرا بانکپن ثابت ہوا

وقتِ بد میں ہر طرف سے چشمکیں ہوتی ہیں نظم
آئینوں میں جابجا سورج گہن ثابت ہوا

وله (۱۷)

آپ کی محفل میں آکر دل مکدر لے چلا
آئینہ لایا تھا میں سدِ سکندر لے چلا

دیدۂ تر لے چلا اشکوں کی چادر لے چلا
میں جدھر اٹھا بسان موج بستر لے چلا

دل صفِ مژگاں کی جانب سی مکدر لے چلا
میں بھی بہرہ کی طرح سے گرد لشکر لے چلا

سامری کے سحر کو پھر زندہ کرنے کے لئے
آکے مٹی تیرے قدموں کی فسونگر لے چلا

روزِ محشر میری از خود رفتگی دیکھو ذرا
خود اسی کے سامنے شکووں کا دفتر لے چلا

نیند میں تجھ کو بھی آخر کچھ خبر ہے یا نہیں
آہو آنکھوں سے تری کاجل چرا کر لے چلا

آکے میخانہ میں ہم مستوں کو پہلے لوٹ لے
کس طرف او ابر دریا بار لشکر لے چلا

دیکھنا صبح شب عیش اس کے گیسو کی شمیم
مٹھیاں بھر بھر کے باسی ہار عنبر لے چلا

زلف برہم ہو گئے اوجھی چٹکیاں ہیکل نے لیں

بوسہ مجھ سے چھین کر بندے کا گوہر لے چلا

میں سرائے دہر میں ٹھہرا تھا مثلِ ابر و برق
کروٹیں دو چار ابھی لی تھیں کہ بستر لے چلا

میری پلکوں سے روانی اشکِ خوں کی دیکھ کر
ابر تر آ کر رگِ سودا پہ نشتر لے چلا

ہم رہے محروم حسن و عشق کے دربار سے
طوق قمری لے چلی طرہ صنوبر لے چلا

بھا گئی ہم کو یہ تیری سیر چشمی اے حباب
آن کر دریا میں بھی خالی ہی ساغر لے چلا

میں تو سمجھا تھا عدم سابق بھی ہے لاحق بھی ہے
ہائے پھر ہستی کی تہمت کیوں لگا کر لے چلا

میں ہمہ تن آہ و نالہ خوابِ مرقد سے اٹھا
استخواں ہر ایک اپنا صورِ محشر لے چلا

کاروانِ گل چلا آخر ہوئی فصلِ بہار
سبزہ خود رو چمن سے اپنا بستر لے چلا

وقتِ آخر آشکارا ہو گئے سب دل کے داغ
خود میں اپنی قبر پہ پھولوں کی چادر لے چلا

بوشگوفوں سے نکل آئی گریباں پھاڑ کر
باغ کو جوش جنوں جامہ سے باہر لے چلا

عفو کا خلعت گناہوں کی ندامت پر ملا
نذر دینے اشک جو لایا تھا گوہر لے چلا

(۲۱) ولہ (۱۸)

آج محشر میں بھی ہوں تشنہ تری بیداد کا
ہیں گلا گھونٹوں خیال آئے اگر فریاد کا

دل کو ٹکرے تو سہی ظالم ملا کر مجھ سے آنکھ
منہ ذرا دیکھوں تو میں ترک ستم ایجاد کا

لاش پر میری اگر آجائے وہ وعدہ خلاف
اتنا کہدینا کہ کیا کہنا تمہاری یاد... کا

جانتے ہو پوچھنے سے حال دل ہوتا ہے رنج
نام کیوں لیتے ہو پھر اُس خانماں برباد کا

تھا منا مجھ کو یہی ہے کوئے قاتل کی زمین
ہر قدم پر سامنا ہونے لگا افتاد کا

ظلم سہہ کر بنایا خود اسے سفاک خلق
داور محشر سے منہ پڑتا نہیں فریاد کا

نہر پر لہرا رہا ہوں میں بطِ مے کے لئے
ڈھل گیا دن دور تک سایہ گیا شمشاد کا

وہ جوانی کے مزے وہ جھگڑے وہ وصل و ہجر
شعبدہ یہ بھی تھا ایک اس چرخِ بے بنیاد کا

عشق کا عالم نظر آتا ہے عالم ہی نیا
ہے زمیں افتاد کی اور آسماں بیداد کا

کون سنتا ہے میری فریاد اس کو دیکھ کر
پڑگیا غل اہلِ محشر میں مبارک باد کا

اب نہ گلشن ہے نہ اپنے آشیانہ کا پتہ
کچھ بگولہ اٹھ کے دیتا ہے نشاں صیاد کا

میں ابھی محو سراپا تھا کہ رات آخر ہوئی
وصل کی شب میں تھا عالم سایۂ شمشاد کا

چہرہ اترا ہی چلا جاتا ہے اس کا شرم سے
کام کرتی ہے نزاکت مانی و بہزاد کا

تیر جستہ ہوں میں غربت ہے سدا اپنا وطن
جس جگہ جا مل گئی بستر ہوا آزاد کا

رہ گیا اپنا سا منہ لیکر میں شوقِ قتل میں

خنجرِ قاتل مجھے آئینہ تھا فولاد کا

ہائے کیا سہما ہوا تھا نالۂ مرغِ چمن

رہ گیا بن کر چراغ اک خانۂ صیاد کا

لشکرِ بادِ بہاری اور جنوں کی کشمکش

گل کا نکلا پیرہن شانہ چھلا شمشاد کا

شیخ کو جھک ہے کہ سمجھائے مجھے شکلِ عروس

ذہن میں لاؤں کہاں سے باقرِ داماد کا

دیدۂ فتاں نے مارا ہے کوئی پرساں نہیں

اس ستم اس قہر اس اندھیر اس بیداد کا

اے فلک اس گردشِ بیجا سے کیا حاصل ہوا

شاد کرنا بھی تجھے آیا کسی ناشاد کا

پاس میرے تم کو تو آتا نہیں یک دم قرار

ہے تعجب دل میں رہ جانا تمہاری یاد کا

منتظم نے آخر گوارا کر لیا داغِ فراق

دل پہ رکھا ہاتھ دامن چھوڑ کر جلاد کا

ہرزہ گردی سے قدم سودے سے سر پیدا ہوا

داغ سے دل درد سے اپنا جگر پیدا ہوا

وہ کھلیں کلیاں وہ مہکے پھول نے جلدی شراب
وہ ہوا آئی وہ ساقی ابرِ تر پیدا ہوا

عشق کا تیری اسی دن سے ہے میرے دل میں داغ
پرتوِ خورشید سے جس دن قمر پیدا ہوا

خون اسی دن سے جگر میرا ہے دل بیتاب ہے
جب حنا میں رنگ پتھر میں شرر پیدا ہوا

ہر گھڑی لپٹائے رہتا ہوں کلیجہ سے اسے
دوسرا معشوق یہ داغِ جگر پیدا ہوا

دل کو بھی آخر مرے عادت الجھنے کی ہوئی
گیسوئے پیچاں کی صحبت کا اثر پیدا ہوا

میں نہ کہتا تھا کہ گلشن میں نہیں جائیں حضور
نالۂ بلبل سے آخر دردِ سر پیدا ہوا

ہاتھ پھیلانے میں شکلِ برگ کچھ حاصل نہیں
دیکھ غنچہ کی طرف مٹھی میں زر پیدا ہوا

آتش افروزی یہ کی کس طالبِ دیدار نے
[illegible] پیدا ہوا

مرتبہ رکھتی ہے اے زاہد سیہ کاری مری
ابرِ رحمت سے مرادامانِ تر پیدا ہوا
میری آنکھوں میں جہاں سارا تجلی زار تھا
نخلِ ایمن اس کو سمجھا جو شجر پیدا ہوا
آپ سے باہر ہوئے جس دم تو پایا دوست کو
اپنا گھر چھوڑا تو اس کے دل میں گھر پیدا ہوا
میری مٹھی میں نہاں ہیں نقلِ اخگر سوز شیں
خاک جب سر کی ذرا داغِ جگر پیدا ہوا
طور خاکستر ہوا ہے قوم موسیٰ کے لئے
تا حقیقت بیں جو تھے کحل البصر پیدا ہوا
ہو چکی طے راہ ہستی جھک گیا اب قدِ راست
شکر ہے ملکِ عدم کا نظم در پیدا ہوا

۱۹ ولہ ۲۰

ہم فقیروں کا ٹھکانہ بھی کہیں ہو جائے گا
جام ہمدم شیشۂ مے ہمنشیں ہو جائے گا
آ کے میخانہ میں جو عزلت گزیں ہو جائے گا
دورِ گردوں اس کو دورِ ساتگیں ہو جائے گا

راستی گر چاہتا ہے کر تواضع اختیار
سیدھا اک سجدہ میں اے نقشِ نگیں ہو جائے گا

دل کو روشن کر اگر ہے نیش زن زنبورِ غم
چاندنی راتوں میں پیدا انگبیں ہو جائے گا

بارِ عصیاں روز لے جایا کریں گے گر ملک
دبتے دبتے آسماں آخر زمیں ہو جائے گا

لے چلی تختِ رواں سے خاکِ مدفن میں فضا
دیدۂ موراب سلیماں کا نگیں ہو جائے گا

پہلے اپنی بات کا پیدا تو کر لے اعتبار
پھر اگر جھوٹوں بھی کہدیگا یقیں ہو جائے گا

کچھ تو رہنے دے قیامت کیلئے بھی اے فلک
کیا عذابِ حشر سب مجھ پر یہیں ہو جائے گا

خود نمائی اس قدر منبر پہ واعظ خیر ہے
نازیہ کرنے سے کیا تو نازنیں ہو جائے گا

خامۂ وذہنِ رسا کا روز افزوں ہے کمال
وہ تو صورت گر یہ معنی آفریں ہو جائے گا

تو ستارہ کو مرے اے پستیِ طالع نہ کھینچ

آسماں کا آسماں زیرِ زمیں ہو جائے گا

آنکھ میں اک رس ہے لیکن شرط ہے طرزِ نگاہ
زہر ہو جائے گا یا یہ انگبیں ہو جائے گا

کچھ دنوں نوکِ مژہ کاوش اگر کرتی رہی
نام تیرا نقشِ دل میرا نگیں ہو جائے گا

بزم میں بے تیرے پہنچا پُر گا ساغر چشم زخم
خط پیمانہ نگاہِ نکتہ چیں ہو جائے گا

بحث رندوں سے نہ کر جا کے واعظ اسقدر
کیا رہے گی پھر اگر ملزم کہیں ہو جائے گا

تجھ سے اٹھیگا بھلا پھولوں کے اُس گہنے کا بوجھ
قدِ موزوں رشکِ شاخِ یاسمیں ہو جائے گا

پھر ذرا تم مڑ کے دیکھو تو سہی زندہ۔ ابھی
کشتۂ تیرِ نگاہِ سُرمگیں ہو جائے گا

زلف گر ہو کر پریشاں کروٹوں میں آ گئی
کھا کے بل ہوئے کمر بھی عنبریں ہو جائے گا

دردِ دل کا نظم کو رہتا ہے رونا روز روز
جان سے بیزار اِک دن ہمنشیں ہو جائے گا

۸ ۲۱

دل نے پھر وارفتۂ حسنِ بت پرفن کیا
اشکِ خوں نے پھر چراغِ آرزو روشن کیا

چھوٹ کر تیرا اس کی چٹکی سے یہ دیتا ہے صدا
آفریں کیا کام تو نے اے اشکار افگن کیا

بوسہ لینے کا تھا کلیوں کے چٹکنے پر جو وہم
شرم سے پھر منہ نہ اس نے جانبِ گلشن کیا

گھل کے کاجل نے کیا آنکھوں کو نیلوفر کا پھول
حجم کے مستی نے لبوں کو غیرتِ سوسن کیا

شمع میں تو آج کی شب روشنی مطلق نہ تھی
تو نے آکر خانۂ تاریک کو روشن کیا

بعد مرنے کے بھی میں ایسا ہوں دشمن کا خلق
شمع نے گریہ نہ اک دن بھی سرِ مدفن کیا

ہے نگاہِ یار شوقِ روزنِ دیوارِ یار
مثلِ دیوار اس نے دل میں بھی مرے روزن کیا

کون سنتا ہے فغان و رویش کی ہم نے تو نظم
آہ کی فریاد کی نالہ کیا شیون کیا

۲۲ — ۱۱

اس نے دکھلا کے جھلک اپنی جو دیوانہ کیا
طور پر جھک کے ادا سجدۂ شکرانہ کیا

تو نے حیرت زدہ حسن کو دیوانہ کیا
آئینہ کو ترے جلوے نے پریخانہ کیا

منزل دہر نہیں چھاؤنی چھانے کا مقام
وہی عارف ہے گذر جس نے فقیرانہ کیا

خاک میں مل کے یہاں نشو و نما ہوتا ہے
سبز موتی کا نہ بارش نے جو دانہ کیا

سارے عالم کو بنایا ہدف تیر اجل
قدر انداز نے یہ شغل حیمانہ کیا

آج گردوں نے کیا شہرۂ آفاق جسے
کل وہ تھے محفل احباب کا افسانہ کیا

کم نہیں دل سے تڑپنے میں سویدا دل کا
اسے اسپند بنایا اسے پروانہ کیا

پھیرنا آنکھ کا عشوہ نے سکھایا مجھ کو
اس میں پیدا اثر گردش پیمانہ کیا

اس کے تو سلسلۂ زلف میں آوارہ نہیں
گوش زد یار کے کس نے مرا افسانہ کیا

سادگی آگئی حسن سے گیا عہد شباب
پھر کبھی آئینہ دیکھا نہ کبھی شانہ کیا

الحذر ظلم بہت جھک کے فلک ملتا ہے
خوف کی بات ہے دشمن نے جو یارانہ کیا

۲۳ — ١٦

کھنچ کے آئیگا سینہ سے جو پیکاں اپنا
پھر بچانا تجھے مشکل ہے گریباں اپنا

اٹھ گئی کشتی مے بزم سے ہنگام سحر
دن چڑھا تخت اڑا لے گئیں پریاں اپنا

اڑ کے جاتی ہے مری خاک ادھر گاہ ادھر
کچھ بتا دے نہ گئی عمر گریزاں اپنا

حشر کے دن بھی میں ہر ایک کا منہ تکتا ہوں
کوئی اب بھی نظر آتا نہیں پرساں اپنا

ہوں وہ شوریدہ کہ موجوں کی طرح پے در پے
چاک ہوتا ہے گریباں پہ گریباں اپنا

کہیں ایسا تو نہ ہو روز سیہ پیش آئے
نہ کہیں رنگ جمائے شب ہجراں اپنا

کی جو اخگر کی طرح گردِ کدورت پیدا
دل گیا خاک میں آخر دلِ سوزاں اپنا

بس کہ تحصیل ادب بے ادبوں سی ہی مجھے
ہی خرابات زمانہ میں دبستاں اپنا

دل یہ کہتا ہے کہ پھر فصل جنوں آئی ہی
خود بخود چاک ہوا ہی جو گریباں اپنا

اپنے ہی پاؤں میں چبھتے ہیں جو بوئے کانٹے
اپنے ہی سر پہ ہوا کرتا ہے احساں اپنا

جوش وحشت میں بھی پابند قناعت ہوں میں
اپنے دامن کو سمجھتا ہوں بیاباں اپنا

اس نے سو مرتبہ شب بھر میں سنوارے گیسو
آئینہ اس کا رہا دیدۂ حیراں اپنا

روز محشر کی بھی ایذائیں اٹھا لوں گا مگر
منہ دکھانا نہ مجھے اے شب ہجراں اپنا

سر بہ زانو ہوئے جب آپ میں رہتے نہیں ہم
جادۂ دشت ہی ہر بخیۂ داماں اپنا

لی خبر حضرت ناصح نے بڑی دیر کے بعد
چڑھ چکا تربت مجنوں پہ گریباں اپنا

وہ زمانہ بھی زمانہ تھا عجب اے حیدرؔ
آشیاں اپنا تھا گل اپنے گلستاں اپنا

۲۴ — ۱۴

ہی ستم مرغ چمن شور مچانا تیرا
زخم دل پر ہے نمک ریز ترانہ تیرا

کبھی ہوتا ہے جو بھولے سے بھی آنا تیرا
یاد آتا ہے شب غم میں رلانا تیرا

کس کا شکوہ کروں کس کا نہ کروں مشکل ہے
آسماں تیرا زمیں تیری زمانہ تیرا

اے فلک خوب ہوں آگاہ روش سے تیری
جانتا ہوں کہ رلائے گا ہنسانا تیرا

حوصلے رہ گئے اے فصلِ جوانی افسوس
ولولے دل کے سوا کم ہے زمانہ تیرا

غمزدہ دردرسیدہ ہوں میں اے شمع مزار
دل دکھاتا ہے مرا اشک بہانا تیرا

یوں نگہ پھیر لے وہ آنکھ ملا کر مجھ سے
اے اجل خوب سمجھتا ہوں بہانا تیرا

حال کھل جائیگا آنے دے بہار اے بلبل
پر اثر ہیں مرے نالے کہ ترانہ تیرا

بیمروت کوئی پھر تجھ سے ملے کس دل سے
آج تک یاد ہے وہ دل کا دکھانا تیرا

اے جنوں سچ ہے گلا کاٹ کے مرجانا تھا
خوب رسوا ہوئے کہنا جو نہ مانا تیرا

حسرت تیر انہیں بھی ہے جو ہیں بے پر و بال
جب سے دیکھا ہے نشانہ کو اڑانا تیرا

تیر لگتا ہے کلیجہ پہ کبھی دل پہ کبھی
ٹھیک پڑتا ہی نشانہ پہ نشانہ تیرا

مسکرائے جو شگوفے تو بہت رویا میں
ہونٹ تیرے مجھے یاد آئے ہنسانا تیرا

تا کجا شرحِ غم و درد خدارا حیدرؔ
ہچکیاں لگ گئیں سن سن کے فسانہ تیرا

۲۵ —— ۱۳

مژدہ اے بادہ کشو ابر بہار آپہنچا
کوہ سے جھوم کے اٹھا لب دریا پہنچا

ہاتھ ملتے رہے سب اسکی دلآزاری پر
نہ گریباں تلک ہاتھ کسی کا پہنچا

چاند کو دیکھ کے طالع شب تنہائی میں
میری آنکھوں میں امنڈتا ہوا دریا پہنچا

ایک جواب اسنے لکھا بھی تو لکھا صاف جواب
بعد مدت کے یہ تقدیر کا لکھا پہنچا

دوستو بہر خدا چھوڑ کے مرقد میں مجھے
اس طرف بھی کوئی بھولا بھٹکا مسافر آپہنچا

خاک مرقد میں وہ ہی جذب کہ تم سُن لینا / گرتا پڑتا اسی منزل پہ مسیحا پہنچا
گوشہ گیری کو وہ اللہ نے شہرت دی ہے / کہ نہ اس کے پر پرواز کو عنقا پہنچا
چاہتا ہی نہ رہے خواب گران غفلت / دل پر ایک زخم لگا زخم کو ایذا پہنچا
اس کے درباں نے کہا دیکھ کے زنداں میں مجھے / دیکھ لینا کہ چھٹا اور یہ سیدھا پہنچا
جلوہ شاہد معنی ہے حریم دل میں / آنکھ جب بند کی مانند نظر جا پہنچا
شانہ گیسو میں جو الجھا تو وہ مجھ سے الجھے / اڑ گئے زلف میں بل ہاتھ کو جھٹکا پہنچا
شب غم میں ملک الموت کا آنا دیکھو / شکر ہے شکر اس آفت میں یہ جیتا پہنچا

مسندِ فقر کا اپنی ہے وہ رتبہ اے نظم
نہ تو قیصر اسے پہنچا نہ تو کسریٰ پہنچا

۲۶ — 11

دل کا طالب وہ ہوا جان کا خواہاں نہ ہوا / وہ ہوا درد کہ جس کا کوئی درماں نہ ہوا
قاتل مہر و وفا دشمن ایماں نہ ہوا / ہائے کافر کو نہ ہونا تھا مسلماں نہ ہوا
کب اسیر زلف سیہ سلسلہ جنباں نہ ہوا / حیف وہ دل کہ حریف خم چوگاں نہ ہوا
ہم کو حاصل یہ ہوا پھونک کے خرمن اپنا / برق کہتی ہے کہ تنکے کا بھی احساں نہ ہوا
ہو گیا سانحہ اپنا بھی عجب عبرت خیز / مفت میں جان بھی دی یار پشیماں نہ ہوا
دل کا سب راز ہے عنوان جبیں سے ظاہر / لاکھ لاکھ اس کو چھپایا کبھی پنہاں نہ ہوا
حلقہ دل زدگاں میں تھا گذر ناصح کا / آج اس بزم میں وہ فتنہ دوراں نہ ہوا

ڈھا دیا دستِ اجل نے تو قضا نے لوٹا
کاغذ باد ہوا تختِ سلیمان نہ ہوا

ساری عالم کا تو معشوق تھا اے حسنِ شباب
کسکا گیسو ترے ماتم میں پریشاں نہ ہوا

نہ مزاج آپ نے پوچھا تو گلہ مجھ کو نہیں
شکر کرتا ہوں کہ شرمندۂ احساں نہ ہوا

فکرِ پاداش نہ کچھ شرمِ گناہ حیف اے نظمؔ
سر بہ زانو نہ ہوا سر بہ گریباں نہ ہوا

۲۷ ۱۴

مختصر مرحلۂ طولِ امل کیا ہوگا
قطع یہ سلسلہ بے تیغِ اجل کیا ہوگا

آج کچھ ہو نہیں سکتا ہے تو کل کیا ہوگا
سر پہ جب آن ہی پہنچے گی اجل کیا ہوگا

دور کر تیرگیِ دل کہ ابھی تنگ ہے وقت
ہو گئی صبح تو روشن یہ کنول کیا ہوگا

حرکتِ چرخ کی بس تیرے ہی آہنگ سے ہے
ورنہ بے صوتِ حدی رقصِ جمل کیا ہوگا

چاہیے گوشۂ دل وادیِ ایمن ہو نہ طور
جلوہ زار اس کا بھلا دشت و جبل کیا ہوگا

ہاتھ میں چوم لوں زاہد ترے پہلے یہ بتا
میری بخشش کا سبب تیرا عمل کیا ہوگا

دیکھ کر زخمِ جگر کو مرے کہتا ہے رقیب
جسکا یہ پھول ہے اس تیغ کا پھل کیا ہوگا

قطعہ

دیکھتا ہوں کبھی حسرت سے تو کہتا ہے وہ شوخ
تو مجھے دیکھ کے جلتا ہے تو جل کیا ہوگا

جب میں کہتا ہوں چلو ترکِ محبت ہی سہی
اس پہ وہ ناز سے کہتا ہے کہ چل کیا ہوگا

حسنِ نیت تو ہی زاہد کا ~ تو معلوم
دیکھنا ہے اثرِ حسنِ عمل کیا ہوگا

بیٹھے ہیں گوشۂ عزلت میں ہم اب توڑ کے پاؤں
ہاتھ منت کش ارباب دول کیا ہوگا

تلخ کامی کی حلاوت کو نہ پوچھو ہم سے
اس سے بڑھ کر مزۂ قند و عسل کیا ہوگا

بڑھتی جاتی ہے ہوس عمر ہے جوں جوں بڑھتی
اس کا انجام اب اے طول امل کیا ہوگا

نظم اک آنی و فانی ہے پھر اس سے ناراض
خالقِ لم یزل و عز و جل کیا ہوگا

۲۸ ——— ۱۵

سرو کی طرح اگر برزدہ داماں ہوتا
مثل غنچہ کے نہ میں سر بگریباں ہوتا

رشکِ فغفور نہ ہم رتبۂ خاقاں ہوتا
آدمی کچھ بھی نہ ہوتا مگر انساں ہوتا

کاش کے پیش نظرِ مجمعِ خوباں ہوتا
اور ان میں سے کوئی جان کا خواہاں ہوتا

مار ڈالا ہے زمانہ کی دورنگی نے مجھے
لاش پر بھی کوئی گریاں کوئی خنداں ہوتا

ہم کہاں بیٹھ کے رستے میں ترے ٹکیں
نقش پا کوئی تو اے عمر گریزاں ہوتا

چھپ گئے گرد میں سب قافلے والے افسوس
اس طرح بھی ہے نظر سے کوئی پنہاں ہوتا

مرغِ بسمل ہوں نہیں میری تڑپنے کا علاج
چاہتا ہوں کہ وہی سر وہی ساماں ہوتا

حلقۂ تدویر کواکب کے مسلسل رہتے
کوئی ان کا نہ اگر سلسلہ جنباں ہوتا

تھا وہ اس عالم اجسام کی لیتا تو کوئی
قطرہ میں بحر تو ذرہ میں بیاباں ہوتا

اعتبارات پہ ہستی کی بنا ہے قائم
ہم نہ ہوتے تو کہاں عالم امکاں ہوتا

ڈر تھا سوز غم ہجراں کا مجھے اے واعظ
میں بھلا خوف سے دوزخ کے مسلماں ہوتا

دیکھ لیتا جو کسی کے یہ ستارہ کا عروج
کہکشاں سی فلک انگشت بدنداں ہوتا
تجکو ثابت قدم اے شمع سمجھتے جب ہم
سوزِ غم کی کوئی حد ہوتی نہ پایاں ہوتا
زاہد خشک بتا پھر تری کیا گت بنتی
کوئی میخوار اگر دست و گریباں ہوتا
دل کا ارمان نکلتا تو ہی مشکل اے نظمؔ
دم نکلنا ہی کسی طرح سے آساں ہوتا

۲۹

آنکھ پھرنے میں جو رنجش کا نہ پہلو ہوتا
حسرت و درد کو کچھ اور جگہ مل جاتی
دم نکلتا بھی تو ہم ضبط ہی کرتے غمِ عشق
ہم سمجھتے، کیا سیماب کو کشتہ ہم نے
پیچ گھونگرنے جو ڈالے ہیں اگر کھل جاتے
اثر کاہِ ربا دل کو ہوا ہے حاصل
جیسا رسوائیوں کا ہے مرے رونے پہ ہجوم
دل کا بوجھ نکلتا جو کسی نالے میں
میرے نالے جو شبِ تار کو سمٹا لاتے
پرخطر تھی شبِ ہجراں کی سیاہی ایسی
آئے گلزار میں صیاد کو نیند آجاتی

۱۵

مجھ کو آہوں سے زیادہ رمِ آہو ہوتا
کا شکے دل سے بھی خالی مرا پہلو ہوتا
نیل ڈھلنا بھی تو آنکھوں میں نہ آنسو ہوتا
اگر اپنے دلِ بیتاب پہ قابو ہوتا
کچھ کمر سے بھی نکلتا ہوا گیسو ہوتا
پھینک دیتے بھی وہ ناوک تو ترازو ہوتا
ایسا میلا بھی آہی نہ لب جو ہوتا
برج میزاں کیلئے سنگ ترازو ہوتا
صبحدم چہرۂ خورشید پہ گیسو ہوتا
دن نکلتا بھی تو سہما ہوا جگنو ہوتا
شاخِ نرگس پہ جگایا ہوا جادو ہوتا

ضبط گریہ بہت آسان تھا گر مشکل تھا
دل میں ناسور تو ناسور میں آنسو ہوتا

ہم دکھا دیتے لہو یوں دل کے نکلتا ہی چاند
بام پر سر کو جو نیوڑھائے ہوئے تو ہوتا

سرمہ بھی دیدۂ فتاں میں لگانا تھا ضرور
ساتھ آہو کے غبارِ رمِ آہو ہوتا

ہم سے بڑھ کر کوئی مجبور نہ ہوگا اے نظمؔ
جان دینے پہ بھی اپنا نہیں قابو ہوتا

۳۰ ——— ۱۸

جلوہ گر آنکھ میں بھی دل میں بھی پنہاں دیکھا
دیکھا دیکھا تجھے او فتنۂ دوراں دیکھا

دل کے آئینہ میں ہم نے رخِ جاناں دیکھا
طور پر آپ نے کیا موسیِ عمراں دیکھا

زیست میں چار طرف مرگ کا طوفان دیکھا
تند آندھی میں چراغِ تہِ داماں دیکھا

تجھ نے پایا نہ قدم طولِ امل کے ہاتھوں
کالے کوسوں پہ مسافر نے شبستاں دیکھا

رشک ہے مجھ کو تری جامہ دری پر اے موج
جس طرف ہاتھ بڑھا اپنا گریباں دیکھا

پاؤں ہی مور و ملخ کے جو اٹھی گرد ذرا
میں نے اسمیں بخدا تختِ سلیماں دیکھا

دیکھا نشتر کوئی کاری تو زبانِ منت
دیکھا پتھر کوئی بھاری تو وہ احساں دیکھا

عالمِ وجد میں کھینچا تھا ابھی دامنِ یار
آگیا ہوش تو اپنا ہی گریباں دیکھا

دل بھر آنے کو بہانہ ہے ذرا سا کافی
رو دیے بزم میں شیشہ کو جو گریاں دیکھا

ہم نہ کہتے تھے کہ یہ جلوہ گری خوب نہیں
معرکہ رات کا ہے شمع فروزاں دیکھا

جھوٹ ہی جھوٹ نہ چلنے تھی کبھی اور نہ شتاب
سچ تو یہ ہے کہ عجب خواب پریشاں دیکھا

قسمت دہر میں لکھی ہوئی ہے ویرانی
میں نے ہر خاک کے ذرہ میں بیاباں دیکھا

جانے والوں میں او دہر کی تو بھی تھے لیکن
سب کے آگے تجھے اے عمرِ گریزاں دیکھا

تو کنارے پہ کھڑا ہو جو رہا چھوڑ کے راہ
تو نے اے سروِ چمن کس کو خراماں دیکھا

عکسِ عارض ہے کسی کے یہ ہوا جوشِ صفا
آب آئینہ سے اُٹھتے ہوئے طوفاں دیکھا

یہ نہیں جانتا کیا ہجر میں گذری مجھ پر
آنکھ کھولی تو طبیبوں کو ہراساں دیکھا

قہر تھا پائے نگارین کا وہ ٹھوکر لینا
فتنۂ حشر کو بھی خون میں غلطاں دیکھا

کشتنی تھا کہ نہ تھا ظلم نہ معلوم مگر
قتل کے بعد ستمگر کو پشیماں دیکھا

۳۱ ۱۳

راہِ الفت میں پس و پیش یہ کب دل آیا
مثلِ آوازِ جرس کے میں دو منزل آیا

قیس نے دیکھ لیا جھانک کے لیلیٰ کا جمال
بید مجنوں جو نظر صورتِ محمل آیا

کفِ افسوس ہے اپنی ہی زمانے کو سرور
اس غم آباد میں میں مثلِ جلاجل آیا

نگہِ شوق نے یہ پردہ دری کیسی کی
آخر اس شوخ کو غصہ سرِ محفل آیا

برق سی تیز کہیں ہے روشِ عمرِ رواں
جس نے اک سانس لی وہ سینکڑوں منزل آیا

مثلِ سبزہ کے نہ سرسبز ہوا نام مرا
مثلِ دانہ کے نہ جب تک تہِ گل آیا

اس سے پہلے کہ جگہ حرص بنائے دل میں
کب نظر موجِ ہوا کا کوئی ساحل آیا

کٹ گئی عمر زباں رک گئی چلتے چلتے
رشتۂ شمع نظر جادۂ منزل آیا

نیم جاں چھوڑ دیا مجھ کو تماشا دیکھو
رحم جلاد کو کیسا دم بسمل آیا

جان دیکر بھی نہ افسردہ ہوئی اہل کرم
ملک الموت کو سمجھے کوئی سائل آیا

نہ کسی جن کا گذر ہے نہ پری کا سایہ
تجھ پہ کوئی نہیں آیا ہی میرا دل آیا

خاکساری طلبوں کیلئے رفعت ہے عجب
دوش احباب پہ میں گور کی منزل آیا

سات پردوں کو جو آنکھوں کے اٹھایا ای نظم
مجھ میں اور اس میں نہ پردہ کوئی حائل آیا

۳۲ ۱۱

زندگی کیا ہے اک افسانہ کا دہرا جانا
موت کہتے ہیں کسے زیست سے اکتا جانا

یاد ہے بزم مسرت میں ترا آجانا
جلوۂ حسن سے وہ شمع کا شرما جانا

مغتنم قلزم ہستی میں رہا تار نفس
ڈوبتے کیلئے تنکے کا سہارا جانا

کبھی آنے نہ دیا خاطر نازک پہ ملال
مجھسے دیکھا نہ گیا پھول کا کمہلا جانا

دل ہے دل اس کا تحمل ہے تحمل اس کا
کوہ کو جس نے پر کاہ سے ہلکا جانا

ہم کو عبرت نہیں اس بیخبری پہ اپنی
کہ طلسمات دو عالم کو تماشا جانا

نہیں معلوم کہاں آئے کہاں جانا ہے
ایسا آنا ہی نہ اچھا تھا نہ ایسا جانا

آشیانہ کے سزاوار نہ تھا پیکر خاک
طائر روح نے اک شب کا بسیرا جانا

میں نے ہر ذرہ کی آغوش میں صحرا دیکھا
میں نے ہر قطرہ کو جولانگہ دریا جانا

جنبش باد بہاری نے نکالی ہے یہ چھیڑ
برق کو ابر کے آغوش میں تڑپا جانا

کس سے پوچھا تھا پتہ کس نے بتایا اے نظمؔ
کس طرح آپ نے میخانہ کا رستہ جانا

۳۳ — دل — ۱۱

تنِ خاکی میں ہے افسردہ مرا دل ایسا — کوئی دانہ ہو الٰہی نہ تہِ گل ایسا
کون ہے اپنے ہوا خواہوں کا قاتل ایسا — شکل تو چاند سی ہے آپ کی اور دل ایسا
بھر گیا پھولوں سے دامانِ نظر حسب سماع — اس قدر کثرتِ گل شورِ عنادل ایسا
گور میں بھی نہیں طوفانِ حوادث سے مفر — موج تو ایسی بلا خیز ہے ساحل ایسا
میں سمجھتا ہوں کہ شادی کا سرانجام ہے کیا — مل رہے ہیں کفِ افسوس جلاجل ایسا
عفو فرمائیے ناصح تو میں اتنا پوچھوں — اس نے دیکھا ہے کوئی حور شمائل ایسا
بخش دے خلد کا گلزار وہ ایسا ہے کریم — اک گناہ کی پرسش کرے عادل ایسا
تیز رو جب تجھے اے ناقۂ لیلیٰ سمجھیں — دیکھے قیس اڑے پردۂ محمل ایسا
تخم باقی نہ رہا کشت جو سرسبز ہوئی — سبزہ آتے ہی گیا رنگ سنہرے تل ایسا
ہاتھ انگڑائیاں لے لے کے بڑھاتے ہیں جو رند — کشتیِ مے کے لئے چاہئے ساحل ایسا

نظمؔ نے ظلم سہے اور کبھی اُف منہ سے نہ کی
ہم نے دیکھا جگر ایسا نہ کہیں دل ایسا

۳۴ — فعلاتن فعلاتن فعلن — ۱۱

آ گیا پھر رمضاں کیا ہو گا — ہائے اے پیرِ مغاں کیا ہو گا

باغ جنت میں سماں کیا ہوگا
تو نہیں جب تو وہاں کیا ہوگا

خوش وہ ہوتا ہے مرے نالوں سے
اور انداز فغاں کیا ہوگا

دور کی راہ ہے ساماں ہی نہیں
اتنی مہلت ہی کہاں کیا ہوگا

دیکھ لو رنگ پریدہ کو مرے
دل جلے گا تو دھواں کیا ہوگا

ہوگا ایک نگہ میں جو تمام
وہ بہ حسرت نگراں کیا ہوگا

ہم نے مانا کہ ملا ملک جہاں
نہ رہے ہم تو جہاں کیا ہوگا

مر گئے جب خاک میں ملنا ٹھہرا
پھر یہ تربت کا نشاں کیا ہوگا

جس طرح دل ہوا ٹکڑے از خود
چاک اس طرح کتاں کیا ہوگا

یا ترا ذکر ہے یا نام ترا
اور پھر ورد زباں کیا ہوگا

عشق سے باز نہ آنا حیدر
راز ہونے دے عیاں کیا ہوگا

۱۴ متفاعلن چار بار ۳۵

یہ ہوا آل حباب کا جو ہوا میں بھر کے ابھر گیا
کہ صدائے لطمۂ موج کی یہ غرور کدھر گیا

مجھے جذب دل نے ہٹا دیئے جو بھٹک کے رکھا قدم کوئی
مجھے پر لگا دیئے شوق نے کہیں تھک کے میں جو ٹھہر گیا

مجھے پیری اور شباب میں جو ہی امتیاز تو اس قدر

کوئی جھونکا بادِ سحر کا تھا مرے پاس سے جو گزر گیا
اثر اس کے عشوۂ ناز کا جو ہوا وہ کس سے بیاں کروں

مجھے تو اجل کی ہے آرزو اسے وہم ہے کہ یہ مر گیا
تجھے اے خطیب چمن نہیں خبر اپنے خطبۂ شوق میں

کہ کتاب گل کا ورق ورق تری بیخودی سے بکھر گیا
کسے تو سناتا ہے ہمنشیں کہ ہے عشق دشمنِ عقل و دیں

تری کہنے کا ہے مجھے یقیں میں ترے ڈرانے سے ڈر گیا
کروں ذکر کیا میں شباب کا سنے کون قصہ یہ خواب کا

یہ وہ رات تھی کہ گذر گئی یہ وہ نشہ تھا کہ اتر گیا
دلِ ناتواں کو تکان ہو مجھے اس کی تاب نہ تھی ذرا

غمِ انتظار سے بچ گیا تھا نوید وصل سے مر گیا
مرے صبر و تاب کے سامنے نہ ہجوم خوف و رجا رہا

وہ چمک کے برق رہ گئی وہ گرج کے ابر گذر گیا
مجھے بحرِ غم سے عبور کی نہیں فکر اے مرے چارہ گر

نہیں کوئی چارہ کار اب مرے سر سے آب گذر گیا
مجھے رازِ عشق کے ضبط میں جو مزہ ملا ہے نہ پوچھیے

مئے انگبیں کا یہ گھونٹ تھا کہ گلے سے میرے اتر گیا

نہیں اب جہاں میں دوستی کبھی راستے میں جو مل گئے
نہیں مطلب ایک کو ایک سے یہ ادھر چلا وہ ادھر گیا

اگر آکے غصہ نہیں رہا تو لگی تھی آگ کہ بجھ گئی
جو حسد کا جوش فرو ہوا تو یہ زہر چڑھ کے اتر گیا

تجھے نظم وادیٔ شوق میں عبث احتیاط ہے اس قدر
کہیں گرتے گرتے سنبھل گیا کہیں چلتے چلتے ٹھہر گیا

١١ مفعلات فاعلاتن دو بار ٣٦

کہیں قابل سماعت مرا حال زار ہوتا
کہ فسانہ خوب تھا یہ اگر اختصار ہوتا

غم عشق تھا تو پھر کیوں غم روزگار ہوتا
نہ یہ جن کبھی اترتا نہ جنوں سوار ہوتا

نہیں خود کو دیکھ سکتا کہ جہاں میں خود ہی یکتا
کبھی اپنے عکس سے بھی وہ نہیں دوچار ہوتا

نہیں تاب ضبط غم کی مرے مشت استخواں میں
بھڑک اٹھتا خس میں پنہاں جو ذرا شرار ہوتا

در دوست کی طلب میں مجھے کیا برا تھا مرنا
جو قدم قدم پہ ہوتا جو ہزار بار ہوتا

مجھے اس خیال پر بس ہے امید عفو اس سے
کہ وہ چاہتا تو ہرگز نہ میں بادہ خوار ہوتا

نہیں اعتنا کے لائق یہ وجودِ بے حقیقت
کہ اگر لباس ہوتا تو یہ مستعار ہوتا

میں سمجھتا مستحق ہوں میں سزا کا یا جزا کا
مری ہست و بود کا بھی تو کچھ اعتبار ہوتا

اگر اپنے سوزِ غم کو نہ دبا دبا کے رکھتا
تو چمک کے اخگر اخگر ابھی اک شرار ہوتا

وہ مآلِ زندگانی جسے کہتے ہیں غمِ عشق
یہ اگر پہاڑ ہوتا تو نہ دل پہ بار ہوتا

دلِ نالہ کش میں قائل قدر افگنی کا تیری
کوئی تیر ایسا ہوتا کہ فلک کے پار ہوتا

۳۷ مفاعلن فعلاتن مفاعلن فعلاتن ۹

جہاں میں کوئی نہ کوئی عدوئے جاں ہوگا
ہوا چمن میں نہ گل چیں نہ باغباں ہوگا

جدھر سے قافلہ گزرے گا خاکساروں کا
سپہر نازکشِ گردِ کارواں ہوگا

لگا کے تیر مجھے روئے گا لہو ظالم
کہ موجِ خوں اسے خمیازۂ کماں ہوگا

یہ آ کے دیکھ کراماتِ میکدہ اے شیخ
کہ ایک جام میں تو پیر سے جواں ہوگا

گلا جو کاٹ کے مرجائے تو یہ ڈر ہے
کہ سب کا اس ستم ایجاد پر گماں ہوگا

نگاہ اس نے جو پھیری تو مر مٹا دل زار
خبر نہ تھی کہ یہ ایسا مزاج داں ہوگا

لگا کے تیغ بگڑیے نہ کیجئے انصاف
تڑپ سکے گا وہ کیونکر جو ناتواں ہوگا

غضب کیا جو کسی کے خرام کو دیکھا
نہ جانتا تھا کہ دل یوں رواں دواں ہوگا

خدا کو ڈھونڈنے جاتا ہے کیا کہیں اے نظم
ہر ایک جا وہ ملیگا جو بے نشاں ہوگا

۳۸ ——— ۱۶

کہا جو تونے دل ناصبور میں نے کیا
بتا کہ تو نے کیا یا قصور میں نے کیا

بغل سے دل کو نکالا کے پھینکدیا
یہ ایک مفت کا جھگڑا تھا دور میں نے کیا

یہ تم کہو کہ نہ آنا یہاں نہ آؤں میں
ضرور تم نے کہا اور ضرور میں نے کیا

تمہارا ذکر ہی کیا تم کو کون کہتا ہے
فساد میں نے اٹھائے فتور میں نے کیا

کہا تھا کس نے کہ موسیٰ سی تو لڑا آنکھیں
اشارہ تجھ سے تھا اے برق طور میں نے کیا

جہاں کہیں ہوئی کثرت رہا میں آپ سے دور
جہاں ملی مجھے خلوت ظہور میں نے کیا

رہوں میں سر بگریباں یہ امر تھا دشوار
یہ سہل تھا کہ گریباں کو دور میں نے کیا

پھرا نہ موج حوادث نے لاکھ منہ پھیرا
چڑھاؤ کاٹ کے آخر عبور میں نے کیا

لگا نہ خاک سی دامن نہ خاک دامن سی
صبا کی طرح جہاں سے مرور میں نے کیا

اب اپنے پاؤں سی پیری میں سر نہیں اٹھتا
سزا یہ اس کی ہے جیسا غرور میں نے کیا

وہ حشر میں بھی ملیں مجھ سے یہ نہیں امید
خفا ہیں اس لیے کیوں وصفِ حور میں نے کیا

یہ اڑ کے تختِ سلیماں کی خاک کہتی ہے
بسیرا اب سرِ بالِ طیور میں نے کیا

وہ میری نالہ سوزاں کو کیا سمجھتے ہیں
قیامت آئی اگر نفخ صور میں نے کیا

خدا نے منہ میں بنا دی زباں میں لکنت
اس ایک بات پہ کتنا غرور میں نے کیا

نگاہِ شوق نے میری سکھا دی آرائش
طرہ کو شانہ کشِ زلفِ حور میں نے کیا

جو مجھ سے رکھتے ہیں اے نظم حسنِ ظن احباب
تو میں سمجھتا ہوں کچھ مکر و زور میں نے کیا

۳۹ —— ۱۶

ہزار آنکھ پڑی جب فرازِ بام آیا
ہمائے حسن پہ نزاد زیرِ دام آیا

یہ کیوں کہا تھا کہ میرا مہ تمام آیا
گیا سحر سے وہ ظالم تو وقتِ شام آیا

ہماری حصہ میں چھوٹا جو اس کا جام آیا
لبِ نگار رہی بوسے کا یہ پیام آیا

ہے سب کو خانہ خرابی یہ نشۂ تعمیر
ہوا غبار جو اونچا تو بن کے بام آیا

جو بھول کر بھی خوشی کا گذر ہوا دل میں
خیال موت کا لینے کو انتقام آیا

دیارِ عشق میں وہ صاحبِ نگیں ہوں میں
کہ یار کے لبِ لعلیں پہ میرا نام آیا

ترانہ سنج ہوئے عندلیب تیرے لئے
ہر ایک گل مئے گلگوں کا لے کے جام آیا

کلیجہ پک گیا ناصح کو منہ لگانے سے
یہ بیٹھے بیٹھے مجھے کیا خیالِ خام آیا

عذابِ جاں مجھے ہو جاتی شامِ تنہائی
بھلے کو ساتھ بلاؤں کا ازدحام آیا

بڑا یہ حقِ محبت ادا کیا اس نے — کوئی جو ساتھ جنازے کے چند گام آیا
زباں کا دانتوں نے پیری میں ساتھ چھوڑ دیا — کوئی رفیق برے وقت میں نہ کام آیا
گیا ہے لینے کو اس کے نگر یقیں ہے مجھے — پیامبر کے لئے موت کا پیام آیا
گماں رقیب کا ناصح پہ ہے بجا مجھ کو — کلیجہ تھام لیا جب کسی کا نام آیا
کھلے جو بند قبا شب کو اس کے میں سمجھا — کہ صبح حشر ہوئی وقت انتقام آیا
نگاہ ہو گئی پریشاں بکھری ہے کاکل بھی — عجب ہے یہ کہ یہ رشتہ تھا بن کے دام آیا

خدا کا خوف کرو نظم ہوش میں آؤ
کرو شراب سے توبہ مہ صیام آیا

۴۰ — 16

به شهوت و غضب آلوده دلِ ما را — بکعبه طرح بنا ریختی کلیسا را
ز خویش رفته گرفتیم راه صحرا را — سلام ما که رساند دیار سلمی را
به بزم جلوه برفتیم همچو آئینه — فروختیم بیک عشوه دین و دنیا را
اگرچه رخصتِ دیدار داده ما را — نگاه قهر تو خوں می کند تماشا را
هوای ابر بهار و جوش صهبا را — شکست توبه صدا کرد جام و مینا را
گذشت عمر و ندیدم که آسمان بکشود — بناخن مه نو عقده ثریا را
قلیل فرصت عمر و کثیر حاصلِ عمر — حباب چشم گشود و بدید دریا را
غبار بام ربود و گردباد ستوں — عجب که خانه برانداختند صحرا را

عبور بحر معانی و دستیاری کلک
شگافتم به عصا چون کلیم دریا را

حذر ز آه فلک تاز تو دل بیمار
که شکل دار بیاد آورد مسیحا را

هزار معنی مثبت ز نفی می خیزد
که بنیتی پی پرواز داد عنقا را

به جستجوی تو ام مثل دانه تسبیح
سپرده ام بسر این راه گام فرسا را

دلم گداخت چو مینا ز هول گرمی حشر
به بین حرارت اندیشهای فردا را

ستاده ام به ره شوق همچو نرگس زار
که آوریم بکف دامن مسیحا را

سراغ میکده دل گرفته ام ز ارشاد
خبر کنید حریفان باده پیما را

مخور فریب نظر تشنه لب بمیر ای نظم
سراب آئینه دار است حال دنیا را

۱۴۱ ۱۰

من و نگاه تو با کیف می چه کار مرا
من و بهار تو با فصل دی چه کار مرا

بغیر صور سرافیل محشر است اینجا
فغان چو خیزدم از دل به نی چه کار مرا

من و شناگری لذت جفای حبیب
به شکوه ستم پی به پی چه کار مرا

فریب عشوه دنیا نخورده ام مخمورم
بناز و غمزه بیجاش هی چه کار مرا

ز بیخودی به گذشتم ز لامکان و مکان
به فکر منتهی لاشئ و شیی چه کار مرا

بلند شد علم مهر و شبنم از جا شد
که با مسابقت ظل و فی چه کار مرا

بمن چو دوست شدی بس ضمان من تست
چنین مگو که بکردار وی چه کار مرا

جزائے ترکِ وفا ایں سعدی می دانست | ولے نہ گفت کہ با ملک زر چہ کار مرا

ق

بہ ظلِ سعدلتِ خسروِ دکن اے نظمؔ | بہ عدل و سطوتِ کسریٰ و کے چہ کار مرا

وظیفہ ام رسد از خوانِ نعمتِ عثمان خلد اللہ ملکہ

بوصفِ حاتمِ طائی و طے چہ کار مرا

۱۲۴ —— مفعول فاعلات مفاعیل فاعلات —— ۱۲۱

دل رازِ عشق کا متحمل نہیں ملا | سر سجدۂ نیاز کے قابل نہیں ملا

دریائے عشق پیر کے دو ہاتھ رہ گیا | موجِ ضعیف تھی مجھے ساحل نہیں ملا

کیا جانے لطفِ عشق کو بخت بے مزہ | ناصح تجھے دماغ ملا دل نہیں ملا

محروم ہم ہیں عید میں بھی او جفا شعار | اب بھی گلے سے خنجرِ قاتل نہیں ملا

جادہ ملا تھا رشتۂ تسبیح کی طرح | آرام مجھ کو سیکڑوں منزل نہیں ملا

گردش سے ہم بھنور میں رہے جس طرح ہلال | کشتی اگر ملی بھی تو ساحل نہیں ملا

کہنے سے پیر کے جبر گوارا کیا تو کیا | کس کام کا ملاپ اگر دل نہیں ملا

ابرو کا اس کے ہمسر ابرو جواب ہے | ایسا کسی کو مدِ مقابل نہیں ملا

انساں کا دل تھا بارِ امانت کے واسطے | اس درد کا کوئی متحمل نہیں ملا

ہو کر نفس گستہ کری عرض شوق کیا | اچھا ہوا کہ قیس کو محمل نہیں ملا

اک برق تھی کہ آگ لگائی نکل گئی | بسمل پھڑک کے رہ گئے قاتل نہیں ملا

ہے نظم نیم جاں پہ چھری تیز رات دن
قاتل کو دوسرا کوئی بسمل نہیں ملا

۴۳ — ۱۶

یاد مشن بخیر جلوۂ دلکش بہار کا
تھا یہ بھی شعبدہ کوئی لیل و نہار کا

پشتارہ لے چلا ہوں غم روزگار کا
گنبد ذرا بلند ہو میرے مزار کا

اونچا ہوا غبار جو اس خاکسار کا
پہنچا فلک کو گور میں صدمہ فشار کا

لو ہوا لہوس اور اہل جنوں کا مقابلہ
کیا توڑنا ہے سہل گریباں کے تار کا

ٹپکیگا خون برق کی لہروں سے باغ میں
ہے جوش میں لہو رگ ابر بہار کا

ہم تو یہ سمجھے اسطرح سے گرے پھر نہ اٹھ سکے
کیا پوچھنا غبار رہ گزار کا

حاصل نہیں ہے زیست کا جز رقص بیخودی
لو میں سمجھ گیا یہ اشارہ شرار کا

ہے ٹوٹنا پسند مجھے شاخ بید کا
ہے جھومنا پسند مجھے لالہ زار کا

دیوار پھاندنے کو ہی نشو نما ہے تاک
دامن پکڑ لیا ہے نسیم بہار کا

ہستی کا قافلہ ہی عدم کی طرف رواں
دور سپہر ایک تتق ہے غبار کا

مانو تو کچھ ہے اور نہ مانو تو کچھ نہیں
بازار دہر میں ہی چلن اعتبار کا

ہر دم ہی دم شماری ہے ہم سے دل کو کام
کھٹکا لگا ہوا ہے یہ روز شمار کا

ناداں نے نفس پہ کرتا ہے آپ ظلم
شکوہ زبان پہ ہے ستم روزگار کا

اس زلف مشکبو کی سیاہی کہیں ملے
کالا کروں گا منہ میں شب انتظار کا

سجدہ کیا ہے جب سے ترے آستان پر — ہے عرش پر دماغ ترے خاکسار کا
شاہوں کو ناز تخت مرصع پہ ہے تو ہو — مالک ہوں میں بھی کلک جواہر نگار کا

۴۴ ۲۳

سینہ میں دل ہے دل میں کچھ ارمان ہو تو کیا — آنکھوں میں اشک میں طوفان نہ ہو تو کیا
سر پر یہاں نہیں ہے جو سامان ہو تو کیا — داماں ہو تو کیا جو گریباں نہ ہو تو کیا
دو دن کے واسطے سر و سامان ہو تو کیا — سب کچھ سہی جو دل ہی میں ارمان ہو تو کیا
مشکل ہے ہاتھ رکھ کے قسم کھا گئے ہیں وہ — بد عہد کے گلے میں جو قرآں نہ ہو تو کیا
کیا اے فلک ملا ہمیں بازار دہر سے — ظالم متاع درد بھی ارزاں نہ ہو تو کیا
لایا ہے کوئی ساتھ نہ لیجائے گا کوئی — دولت ہوا ور عادت احسان نہ ہو تو کیا
ہے قد سے قد ملا کے بہت سرو کو غرور — اس طرح ناز سے جو خراماں نہ ہو تو کیا
تالو سے جب زباں نہیں لگتی جناب کی — ناصح بھلا دماغ پریشاں نہ ہو تو کیا
راضی ہوں قصد خون نہ دے ذبح کیجئے — تسکین دل جو عیسیٰ دوراں نہ ہو تو کیا
سالک کو حق کے ڈھونڈھتی ہیں کچھ فرا — اس راستہ میں بھول بھلیاں[1] نہ ہو تو کیا
دن میری زندگی کے گذر جائیں صبح تک — اتنا بھی طول شب ہجراں نہ ہو تو کیا
رکھا نہ معصیت نے کہیں کا ہزار حیف — بندہ ہوا و تابع فرماں نہ ہو تو کیا
مانا کہ تو نے غیر کیا نظم اپنا حال — معلوم اس کو حال پریشاں نہ ہو تو کیا

لہ بھول بھلیاں محاورہ میں مفرد مؤنث ہے ۱۲

مانا کہ تو نے جوگ لیا دردِ عشق میں
اس حال پر بھی گر کوئی پرساں نہو تو کیا

یہ تو بتا کہ چاک گریباں سے فائدہ
جب تیرا ہاتھ اور اس کا گریباں نہو تو کیا

مانا کہ تیرے اشک میں گوہر کی ہے چمک
عارض پہ اس کے وصل میں غلطاں نہو تو کیا

اچھا یہی سہی کہ وہ محشر خرام ہے
تلووں کے نیچے دیدۂ حیراں نہو تو کیا

یوں خاک نعل میں لوٹ گئے تم تو کیا ہوا
قاتل کا اپنے ہاتھ میں داماں نہو تو کیا

جھک جھک کے ڈھونڈتا ہے عبث اس گلی میں تو
اس خاک میں ترا دلِ نالاں نہو تو کیا

جاتا ہے اس کے در پہ تو اتنا سمجھ تو لے
گر تیرے روشناسوں میں درباں نہو تو کیا

گر اذنِ عام غیر کو ہے تو ہوا کرے
تیرا گذر وہاں کسی عنواں نہ ہو تو کیا

کہتے ہو جو پڑیگی مصیبت اٹھائیں گے
لیکن وہ ظلم کر کے پشیماں نہو تو کیا

سوچے ہو جان دینگے جو دشوار ہوگا وصل
مرنا بھی مر کے جان جو آساں نہو تو کیا

١١

٤٥

بندہ کسی طرح نہ سزائے جحیم تھا
یارب میں روسیاہ سہی تو کریم تھا

کوٹھے پہ آکے نعش کا جانا تو دیکھئے
لے اٹھ گیا جو تیری گلی میں مقیم تھا

واعظ خدا کے واسطے اس کو تو دیکھ
پیتے اگر نہ مے تو گناہِ عظیم تھا

کیا کرتے ہم کہ ضبط سے گھبرا گیا تھا جی
کھینچی اک ایسی آہ کہ بس دل دو نیم تھا

نازک ہی انتہا کا دماغ فروتنی
ہم کو تو سر اٹھانا ہی بار عظیم تھا

دنیا کی نعمتوں میں برابر کا زہر ہے
اصلاح تو یہ دیکھئے آخر حکیم تھا

اک ہم تھے اور حسرتِ اعمال قبر میں — آخر کوئی رفیق نہ کوئی ندیم تھا

دنیا سے دل اٹھا کے عجب کچھ دلی — اک دوش پر جنازۂ امید و بیم تھا

ساتوں فلک نہ بارِ امانت اٹھا سکے — ہم نے اٹھا لیا وہ جو بارِ عظیم تھا

اے آسمان میری تباہی روا نہ تھی — تھا خاک بھی تو خاک رہِ مستقیم تھا

اے نظمِ خوب راہ نمائی جنوں نے کی
گلشن گئے دشت ایک خطِ مستقیم تھا

۱۵ ٦

میں پا کے اس سے عفو کا پروانہ چھٹ گیا — اہلِ خرد دھرے گئے دیوانہ چھٹ گیا

کیا حالِ پرملال شبِ غم بیاں کروں — ظلمت وہ تھی کہ شمع سے پروانہ چھٹ گیا

آئی بھی اب مزہ یہ کہانی شباب کی — کس لطف کے مقام سے افسانہ چھٹ گیا

کس راستہ سے ناقۂ لیلیٰ کو لے چلا — اے ساربان قیس کا ویرانہ چھٹ گیا

مستی میں ایک کی نہ رہی ایک کو خبر — شیشہ سے بزمِ عیش میں پیمانہ چھٹ گیا

کاجل لگا کے لاش پہ رونے کو آئی تھے — اشکوں سے رنگِ نرگسِ مستانہ چھٹ گیا

کو اضطراب شوق بھی نکلا حریف ہم — چٹکی میں آ کے شمع کی پروانہ چھٹ گیا

قابو سے نفسِ بد کو نکلنے نہ دے کبھی — پھر شیر ہی جو یہ سگِ دیوانہ چھٹ گیا

دیکھا فریبِ حیرتِ بزمِ وصال کا — دستِ مژہ سے سبحۂ صد دانہ چھٹ گیا

دی آ کے کیا نسیم نے حیرت فزا خبر — ہر شاخِ گل کے ہاتھ سے پیمانہ چھٹ گیا

تھا وصلِ روح و تن نفسِ واپسیں تلک	دم بھر میں ایک عمر کا یارانہ چھٹ گیا
احسان یہ کیا عرقِ انفعال نے	دامن سے داغ گریۂ مستانہ چھٹ گیا
واعظ بتا مجھے کہ یہ کس کی نظر لگی	ہونٹوں تک آ کے ہاتھ سے پیمانہ چھٹ گیا
زاہد جو شہر چھوڑ کے صحرا نشیں ہوا	اس کو یہی قلق ہے کہ میخانہ چھٹ گیا

رکھا ہے کیا وطن میں اب اے نظمِ خستہ جاں
ہو اس لئے اداس کہ ویرانہ چھٹ گیا

۷۴ — مفعول فاعلاتن دوبار — ۱۴

پرسش جو ہوگی تجھ سے جلاد کیا کرے گا
لے خوں میں نے بخشا تو یاد کیا کرے گا

ہوں دام میں پرافشاں اور سادگی سے حیراں
کیوں تیز کی ہیں چھریاں صیاد کیا کرے گا

ظالم یہ سوچ کر اب دیتا ہے بوسۂ لب
جب ہونٹ سی دئیے پھر فریاد کیا کرے گا

زنجیر تارِ داماں ہے طوق اک گریباں
زورِ جنوں نہ کم ہو حداد کیا کرے گا

ہم ڈوب کر مریں گے حسرت رہیگی تجھ کو
جب خاک ہی نہ ہوگی برباد کیا کرے گا

یعقوب قطع کر دیں امید وصل دل سے
یوسف سا بندہ کوئی آزاد کیا کرے گا

دل لے کے پوچھتا ہے تو کس کا شیفتہ ہے
بھولا ابھی سے ظالم پھر یاد کیا کرے گا

اے خطِ بیاضِ عارض درکار ہے جو تجھ کو
تحریرِ حُسن کی کچھ روداد کیا کرے گا

کنجِ قفس سے اک دن ہوگی رہائی اپنی
مر جائیں گے تو آخر صیاد کیا کرے گا

مثلِ سپند دل ہے بیتاب سوزِ غم میں
رہ جائے گا تڑپ کر فریاد کیا کرے گا

اے شیخ بھر گیا ہے کیوں وعظ کی ہوا میں
ریشِ سفید اپنی برباد کیا کرے گا

ظلم و ستم سے بھی اب ظالم نے ہاتھ کھینچا
اس سے ستم وہ بڑھ کر ایجاد کیا کرے گا

از بسکہ بے ہنر ہوں میں ننگِ معترض ہوں
مضموں پہ میرے کوئی ایراد کیا کرے گا

اے نظم جس کو چاہے وہ دے بہشت دوزخ

نمرود کیا کرے گا شداد کیا کرے گا

۸۴ —— مفاعیل مفاعیل مفاعیل مفاعیل —— ۲۰

واعظ نے در کعبۂ عرفاں نہیں دیکھا
عارف نے صنم خانۂ امکاں نہیں دیکھا

جی بھر کے ابھی جلوۂ جاناں نہیں دیکھا
تم نے اسے اے موسیٔ عمراں نہیں دیکھا

گلشن نہیں دیکھا کہ بیاباں نہیں دیکھا
جمعیت دل کا کہیں ساماں نہیں دیکھا

یہ آئینہ خانہ ہے طلسمات خودی کا
ویراں اسے دیکھا ابھی تعمیر ویراں نہیں دیکھا

دل تا لب خاموش ہے نالہ کی گذرگاہ
گردوں کو حریف خم چوگاں نہیں دیکھا

پھر رک نہ سکیں گی یہ جوانی کی امنگیں
روکو ابھی توسن نے بیاباں نہیں دیکھا

زاہد کی کمیں گاہ سے واقف ہے بھلا کون
کیا جانے وہ جس گرگ نے باراں نہیں دیکھا

کیا جانے پریشانی خاطر وہ کسی کی
اس نے تو کبھی خواب پریشاں نہیں دیکھا

پہنچا ہی منزل پہ، ملی جس کو رہ راست
اس کو کبھی افتاں کبھی خیزاں نہیں دیکھا

آساں جسے سمجھے اسے آساں ہی پایا
مشکل جسے سمجھے اسے آساں نہیں دیکھا

دم لے کے ذرا راہ میں جب تک میں اٹھوں
کوسوں تجھے اے عمر گریزاں نہیں دیکھا

رہ رہ کے اڑی خاک سلاطین سلف کی
گردوں سے کبھی دست و گریباں نہیں دیکھا

جس تیر نے پلہ نہ کیا ہے وہ رکاہ
بیکار ہے جس تیغ نے میداں نہیں دیکھا

وادی حقیقت میں پھرا جو ہی جانے
ایسا بھی جنوں خیز بیاباں نہیں دیکھا

ہے گلکدۂ دہر میں حیرت کی تجلی
نرگس نے کبھی سایۂ مژگاں نہیں دیکھا

مستوں کے لیئے رشک کی جا ہے سفر برق
جز ابر سیہ اور شبستاں نہیں دیکھا

کیا حال گلستاں کا کہے جو کوئے خزاں کے
طاؤس کو اس طرح پر افشاں نہیں دیکھا

ہے سایہ فگن فرق پہ گرد قدم اپنی
بکھرے ہوئے یوں چتر سلیماں نہیں دیکھا

وحشت میں بھی پابند رہا وضع کا اپنی
کوچہ کوئی جز چاک گریباں نہیں دیکھا

کیا پوچھنا اے نظم اس آزادہ روی کا
یوں سرو کو بھی بر زدہ داماں نہیں دیکھا

۴۹ ۲۱

سب دل کا بخار آنسوؤں کے نم نے کھینچا
آندھی کو رگ ابر گہر بار نے کھینچا

ہر اشک کے سیلاب میں جھنکار کی آواز
پرکالہ دل گریہ سرشار نے کھینچا

نقشہ نہ کھنچا خواب پریدہ کا کسی سے
کھینچا تو مرے دیدہ بیدار نے کھینچا

ایسی ہی ترے ہاتھ کے بوسہ کی تمنا
اس شوق میں چلہ لب سوفار نے کھینچا

شق القمر انگلی کے اشارہ سے دکھایا
قشقہ جو بت آئینہ رخسار نے کھینچا

کن کن ثمروں کو قد موزوں نے سنبھالا
کس بوجھ کو موئے کمر یار نے کھینچا

بگڑے کبھی جکڑی ہی رہے گیسوئے شب عشرت
نالہ کبھی پازیب کی جھنکار نے کھینچا

چھپ چھپ کے کبھی رویا تو گنہگار ہوا میں
محشر میں گریباں غم دلدار نے کھینچا

میر اوج داغ ہی افشاں کا ستارہ
کاکل سے رہائی ہوئی رخسار نے کھینچا

مجنوں کو مری وحشت نوری پہ حسد ہے
کانٹا جو چبھا پاؤں میں خوں خار نے کھینچا

جب آہ کی آثار سحر کے نظر آئے
سورج کی طنابوں کو دلِ زار نے کھینچا

چھالوں نے مرے پاؤں کو آنکھوں سے لگایا
دامن کو مرے دشت کے ہر خار نے کھینچا

پھر تم مجھے کہنا نہ کبھی مرشدِ منصور
نعرہ نہ انا الحق کا اگر دار نے کھینچا

چور رنگ لگانے کا جو ابرو کو ہوا شوق
آہوئے حرم طرۂ طرار نے کھینچا

لی ابرِ بہاری نے پرِ زاغ کی رنگت
نقشہ وہی طاؤس کا گلزار نے کھینچا

گریہ کا تعلق مری پلکوں سے عجب ہے
سیلاب کا دامن نہ کبھی خار نے کھینچا

خورشیدِ سحرگاہ کا جب تک نہ کیا خون
قشقہ بھی نہ ہندوئے شبِ تار نے کھینچا

لہرانے لگا خونِ جگر نوکِ مژہ پر
گلزار کو خارِ سرِ دیوار نے کھینچا

تو راہ زنِ سعی تھا او ابلہ... پا
اچھا ہوا سولی پہ تجھے خار نے کھینچا

دورِ مے گلرنگ رہا شب کو یہاں تک
آغوش میں بے ہوش کو ہشیار نے کھینچا

سولی نظر آئے گی مسیحا کو فلک پر
نالہ جو کسی دن ترے بیمار نے کھینچا

۵۰

باور سخنِ غیر کو فرہاد نہ کرنا
سمجھا گئے ایسا کہیں ارشاد نہ کرنا

صدموں کا گلا اے دلِ ناشاد نہ کرنا
جلاد کو چاہا ہے تو فریاد نہ کرنا

گیسو سے رہا تم دلِ ناشاد نہ کرنا
اب دام میں لائے ہو تو آزاد نہ کرنا

یہ تو نہیں کہتا میں کہ بیداد نہ کرنا
ہاں اپنی طرف سے کوئی ایجاد نہ کرنا

بھولا نہیں فرقت کا زمانہ مجھے اب تک
وہ میرا تڑپنا وہ ترا یاد نہ کرنا

ہو خاک اڑانے کو تو کئے سرِ مقتل
اور حیف یہ ہو خاک کو برباد نہ کرنا

غنچگی کا ہے کلی کوئی نہ کنول کی پھوٹی
نالہ ابھی اے مرغِ چمن زاد نہ کرنا

ہم بیٹھے وہ اس اقرار پہ کرتے ہیں ملاقات
ہم ظلم کریں تم پہ تو فریاد نہ کرنا

یاد نیم شبی میں جو مزہ آتا ہے تجھ کو
تو قتل میں جلدی کا کہیں جلاد نہ کرنا

سمجھو ہی جادو ہے نہ رنگان بہ کلف کا
دیکھو مرے اشعار پہ ایراد نہ کرنا

بندہ تو اس اقرار پہ بکتا ہے ترے ہاتھ
لیتا ہے اگر مول تو آزاد نہ کرنا

اور وعدہ خلافی پہ تغافل کی قسم ہے
تا عمر مجھے بھول کے بھی یاد نہ کرنا

اے نظم عجب لطف ہے دیوانہ دلی میں
ہاں ترک کبھی عشقِ پری زاد نہ کرنا

١٥ فعلاتن مفاعلن فعلات ١٦

کبھی تیوری چڑھا کے دیکھ لیا
اور کبھی مسکرا کے دیکھ لیا

اُف نہ کی آزما کے دیکھ لیا
تم نے چھریاں لگا کے دیکھ لیا

دل کو تلووں سے مل کے وہ بولے
کیوں ذرا تلملا کے دیکھ لیا

دیکھ سکتے تھے آنکھ سے نہ جسے
اس کو دل میں چھپا کے دیکھ لیا

بھول بیٹھے ہیں سب قدم اس کے
ہم نے آنکھیں بچھا کے دیکھ لیا

حال اس شوخ نے مرے دل کا
کیا نظر میں سما کے دیکھ لیا

مجھ پر احسان ہوا نزاکت کا
تو نے گر آنکھ اٹھا کے دیکھ لیا

دیکھنا ہی نہ تھا ادھر دل زار
تیرے کہنے میں آ کے دیکھ لیا

دھجیاں آستیں کی کہتی ہیں
ہاتھ بیجا بڑھا کے دیکھ لیا

مرگیا میں سمجھ کے سچ اس کو
کیوں بہانہ بنا کے دیکھ لیا

ایک ہی ہاتھ کا تھا سارا جہاں
ہاتھ ہم نے اٹھا کے دیکھ لیا

کچھ نہ سمجھا کہ اس نے جاتے وقت
ہائے کیوں منہ پھرا کے دیکھ لیا

کچھ کرو اپنی ہی سی کرتا ہے
دل کے ٹکڑے اڑا کے دیکھ لیا

نزع میں بھی ملا جو نامۂ یار
اُٹھ کے بیٹھا اٹھا کے دیکھ لیا

دل کی چوری بھی کھل گئی سب پر
آنکھ تم نے چرا کے دیکھ لیا

نہ ہوا داغ کا جواب اے نظم
طبع کو آزما کے دیکھ لیا

۵۲ ——— مشاعرہ سرونج نمبر ——— ۶

کام آخر نہ ہونا تھا نہ ہوا
فکر کا ہیکلی اب ـ ہوا نہ ہوا

خاک پا ہو کے نقش پا نہ ہوا
تیرے قدموں سے میں جدا نہ ہوا

دل تو دیتا ہے تو مجھے یارب
اور اگر درد آشنا نہ ہوا

حسن اس کا نہ آنکھ دیکھ سکی
سات پردے تجھے سما نہ ہوا

ہم کو کہنا تھا جو وہ کہہ گزرے
دل میں قائل ہوا وہ یا نہ ہوا

لہ زمین اپنی مرحوم کی نکالی ہوئی ہے ۱۲

تو نے روزِ الست حیف اے نظمؔ
وعدہ تو کر لیا وفا نہ ہوا

ولہ

۵۲ ۱۶

دم گیا شوقِ جستجو نہ گیا
دل گیا داغِ آرزو نہ گیا

عارضوں کی صفا سے شرما کر
آئینہ اس کے روبرو نہ گیا

کہیں ہوتے ہیں سنگدل ایسے
رحم دل میں تمہارے چھو نہ گیا

لے اڑا مرغِ نامہ بر مکتوب
دلِ بیتاب ساتھ تو نہ گیا

خاک میری رہی صبا کے ساتھ
مر کے بھی شوقِ جستجو نہ گیا

گھونٹ ڈالا گلا گریباں نے
دستِ کوتاہ تا گلو نہ گیا

خلد میں خاک پھر ملے گا لطف
ساتھ جب ساغر و سبو نہ گیا

تھا جو مجھ کو لحاظ قاتل کا
اڑ کے دامن تلک لہو نہ گیا

پی کے مے شیخ ہو گیا بے خود
پھر بھی تقویٰ رہا وضو نہ گیا

ولولے وہ رہے نہ جوشِ شباب
ہائے ایک جوشِ آرزو نہ گیا

تا کمر بڑھ کے طرۂ سنبل
مثلِ گیسوئے مشک و بو نہ گیا

میری آغوش کی سی شکل جو تھی
شرم سے وہ کنار جو نہ گیا

کسی محفل میں وہ بہارِ حسن
بے طلسماتِ رنگ و بو نہ گیا

مر رہا آ کے میں ترے در پر
ٹھوکریں کھانے کو بکو نہ گیا

اڑ رہا ہوں غبارِ ہو ہو کر — زورِ پروازِ جستجو نہ گیا

نظمؔ اس سال بھی زیارت کو
جانے والے تھے لوگ تو نہ گیا

۱۲ — ۹۴

خیال و خواب سا گذرا نظر مثلِ سراب آیا
یہی جلدی تھی جانے کی تو کیوں عہدِ شباب آیا
کہاں اے نظمؔ لے کر کاروانِ صبر و تاب آیا
جہاں سو بار طوفاں موج خیز اضطراب آیا
شبِ غم میں ستاروں کے لئے روزِ حساب آیا
مری اختر شماری کو سمجھتے ہیں عذاب آیا
سحابِ تیرہ لے کر خیمۂ مشکیں طناب آیا
اور اس ظلمات میں ساقی نہ لے کر آفتاب آیا
عبث کی گردشِ افلاک نے گہوارہ جنبانی
نہ دل ٹھہرا نہ غم بھولا نہ موت آئی نہ خواب آیا
نکل اے جانِ مضطر میں بھی اب ہوں ہمعناں تیرا
ٹھہر اے عمرِ رفتہ میں بھی تیرے ہم رکاب آیا
فلک آمد رفت ہے کائنات اس بزمِ عالم کی

مے عشرت کا پیمانہ حباب اندر حباب آیا

جواہر ریز ہے گردوں طرب انگیز ہے ہاموں
شفق سے شیشۂ شبنم میں یاقوت مذاب آیا

قدم سے طاقت رفتار کچھ کہتی ہے رہ رہکر
میں اب جھک جھک کے چلتا ہونکہ سن لیجئے جواب آیا

شب غم میں نہ پوچھو دم نکلنے میں ہے کیا لذت
اجل اس طرح سے آئی کہ میں سمجھا کہ خواب آیا

ہے قسمت نہ منظر کیا جی بھر کے نظارہ
نہ بسمل کی پلک جھپکی نہ قاتل کو حجاب آیا

نہ جا میخانہ میں اے نظم ہم تجھسے نہ کہتے تھے
وہاں سے ہو کے بیہوش و سیہ مست و خراب آیا

حرف (ب)

۵۵

اٹھا ہوں مثل گرد قدم کی صدا سے کب
کھینچا ہوں احتیاج کا داغ التجا سے کب
سختی کو جھیل جا تو سعادت شکار ہے
ہرگز گھٹا نہ عشق رہ مستقیم کا

۱۵

پائونگا قافلہ کا پتہ نقش پا سے کب
او ہنر رہ کار آگ بجھی ہے ہوا سے کب
خالی ہے اس پہاڑ کی چوٹی ہما سے کب
سر کا یہ آفتاب خط استوا سے کب

کب ہوگا برطرف غم و اندوہ اے کریم — پانی سفید ہوگا کالی گھٹا سے کب
فریاد کس سے کیجیے گردوں کی دور میں — نکلی پسے ہوؤں کی صدا آسیا سے کب
تو بھی تو ہم کلاب تھا اے شوق کوئی بات — پیچھے میں رہ گیا ہوں صدائے درا سے کب
موتی سی آبرو کو ہو کیا حرص میں فروغ — اٹھتی ہے موج آب گہر میں ہوا سے کب
ہے اس طرف ہر ایک رگ جاں کھنچی ہوئی — یہ ربط کاہ کو ہے بھلا کہربا سے کب
پہنچی ہے ٹھیک وقت پہ مخیّم تنک گھٹا — کیا جانیے چلی تھی یہ کوہ صفا سے کب
دو رخ ہی میں گرائیگا لیجا کے نفس شوم — یہ پوچھتا ہے راہ کسی رہنما سے کب
کیا جانے کب طلسم خودی سے نجات ہو — نکلے یہ عکس آئینۂ ماسوا سے کب
ہم کو تمھارے نام کی پھر کیوں ہوس نہ ہو — دھویا تھا ہاتھ خضر نے آب بقا سے کب
جب دل کو ظلم سہنے میں آنے لگا مزہ — توبہ وہ کرنے بیٹھے ہیں جور و جفا سے کب

نکلے گا دل سے نظم کے کیونکر غم حسین
جاتا ہے رنگ لعل سے سرخی حنا سے کب

۶۵ ولہ ۹

کوئی مے دے یا نہ دے ہم رند بے پروا ہیں آپ
ساقیا اپنی بغل میں شیشۂ صہبا ہیں آپ
غافل و ہشیار دو تمثال یک آئینہ ہیں
ورطۂ حیرت میں ناداں آپ ہیں دانا ہیں آپ

کیوں رہے میری دعا منت کشِ بالِ ملک
نالۂ مستانہ میرے آسماں پیما ہیں آپ

ہے تعجب خضر کو اور آبِ حیواں کی طلب
اور پھر عزلت گزینِ دامنِ صحرا ہیں آپ

منزلِ طولِ املِ در پیش اور مہلت ہے کم
راہ کس سے پوچھیے حیرت میں نقشِ پا ہیں آپ

حق سے طالب دید کے ہوں ہم بصیر ایسے نہیں
ہم کو جو کوتہ نظر سمجھیں وہ نابینا ہیں آپ

گل ہمہ تن زخم ہیں پھر بھی ہمہ تن گوش ہیں
بے اثر کچھ نالہائے بلبلِ شیدا ہیں آپ

حرص سے شکوہ کروں کیا ہاتھ پھیلانیکا میں
کہتی ہے وہ اپنے ہاتھوں خلق میں رسوا ہیں آپ

ہم سے اے اہلِ تنعم منہ چھپانا چاہیے
دم بھرا کرتے ہیں ہم اور آئینہ سیما ہیں آپ

حرف (ت)

۱۴ ۱۷

لہ دم پڑنے سے آئینہ مکدر ہو جاتا ہے ۱۲

سخن میں ہے گہر آبدار کی صورت
قلم میں ہے رگ ابر بہار کی صورت

عدم کا خواب بھی نرگس کو خواب نوشیں تھا
کہ آنکھ کھول کے دیکھی بہار کی صورت

طواف کیجیو اس آستاں کا جس دم سے
ہوئی فلک کے لیئے روزگار کی صورت

قسم یہ دم کے چلی ہو کہ بےقرار نہ ہو
بتائے جائیے دل کے قرار کی صورت

ہلال عید کو میں دشنۂ قضا سمجھا
کہ چاند دیکھ کے دیکھی رخ یار کی صورت

ترے فراق میں لیں میں نے کروٹیں تا صبح
نہ بن پڑی کوئی لیکن قرار کی صورت

خدا دکھائے نہ دشمن کو بھی وہ کالی رات
بہت بری تھی شب انتظار کی صورت

خدا کا فضل ہو مالک جو کن کے شامل حال
برس پڑے کہیں ابر بہار کی صورت

کبھی فراق میں تارے گنے کبھی گھڑیاں
نظر میں پھر گئی روز شمار کی صورت

بس انتظار جو کھینچا تو میری آنکھوں میں
کھنچی ہوئی ہے تری انتظار کی صورت

ہر ایک برگ خزاں دیدہ ہے وہ آئینہ
کہ جس میں دیکھ رہا ہوں بہار کی صورت

نہاں ہے فیض کا چشمہ بھی خاکساروں میں
کہ ابر کا ہے ہیولا غبار کی صورت

شگفتہ ہے گل تر کی طرح سے شعلۂ شمع
حریر شعلہ سے ظاہر ہے خار کی صورت

ہمیں کو دخل سفید و سیہ میں تھا اے نظم
رہی نہ ہائے وہ لیل و نہار کی صورت

۵۰ ۴۱

کرتا ہے ظلم و جور یہ چرخ کہن بہت
مل گئے ہیں خاک میں گل پیرہن بہت

اک مشت استخواں پہ گناہوں کا بوجھ ہے
نقشہ چمن میں غفلت اہل جہاں کا ہے
ہم کو بھی مل رہےگی کسی سے سخن کی داد

تھا اس نحیف و زار کو بار کفن بہت
اترا رہے ہیں پھول پہن کر کفن بہت
جوہر شناس سیکڑوں ہیں اہل فن بہت

۵۹ وله ۳۷

پرتو حسن تو در آئینہ تا افتادہ است
شور ما و من بہ بزم ماسوا افتادہ است
آئینہ در ورطہ از جوش صفا افتادہ است
طبع روشن ہر کہ میدارد زپا افتادہ است
کوچہ زلف و شب دیجور و تاریک و تار
دل بیقرار و نمیدانم کجا افتادہ است
شکوہ دارم زانداز گراں جانی خویش
ہست چوں سنگے کہ در راہ وفا افتادہ است
کشتی صبرم بطوفان ہوا افتادہ بود
بر کنار اینک بہ موج بوریا افتادہ است
سایہ بر خورشید افتادست از زلف سیاہ
شعلہ در آئینہ از رنگ حنا افتادہ است
انس بگرفتم زبس باخانہ ویرانی خویش

سبزهٔ بیگانه با من آشنا افتاده است
شرمسارم عذر بدتر از گناه آورده ام
پرده بر رشتهٔ من از دستِ دعا افتاده است
شور یارب بر لب و دست تظلم بر فلک
شیشهٔ صبرِ من از بامِ دعا افتاده است
من همه تن گوش باشم بر صدای الرحیل
در دو چشم گردِ آوازِ درا افتاده است
ماندگیِ پاے من سلسلے که بر من بسته بود
بر سرم از صدمهٔ شورِ درا افتاده است
برق را گفتم بجو از هستی راهِ گریز
از میانِ جست و در آغوشِ فنا افتاده است
چون الف آهے کشم وز هستیِ خود بگذریم
در کمندِ وحدتم صیدِ فنا افتاده است
گردشِ نه آسمان و یک دلِ نالانِ من
دانه هست و بدستِ آسیا افتاده است
انقلابِ چرخ نتواند مرا از جا برد
من دلے دارم که قطبِ آسیا افتاده است

باز آمد تشنه کام از بسکه اسکندر بدید
بیضه اندر چشمهٔ آب بقا افتاده است

نسبتی دارد حدوثِ دهر با لوحِ قدم
همچوں آں نقشی که بر آبِ بقا افتاده است

هر قدر نزدیک تر آید بگردد دور تر
سالکِ راهش بره چوں نقش پا افتاده است

سر نگوں گشتم ز پیری من کجا و فکرِ شعر
طرفه مضموں بلندی پیش پا افتاده است

مید هد جامِ فنا بر کف صلا ضحاک دهر
دورِ جم آخر شد و نوبت بما افتاده است

نقدِ فرصت را بیغما می برد نفسِ حریص
حیف ازیں دزدی که در کالای ما افتاده است

ناروائی هست آخریں دکانِ اهلِ فن
نقدِ معنی چوں متاع ناروا افتاده است

کهکشاں با کج روی تا آسمانها سر کشید
بر زمیں چوں نظمِ خطِ استوا افتاده است

بسکہ جوش اضطرابِ شوقِ برقِ خرمن ست
تا تو دریابی مرا من نیستم خاکِ من ست

از غمِ عشقش بیا سائیم نہ این کارِ من ست
خوش بیفروزیم آتش تا ہوا ور دامن ست

تا مرا تاب و توان و ہوش خرمن خرمن ست
جملہ وقفِ انتظار و شوقِ برقِ ایمن ست

از کواکب بر سرِ ما ریخت گرد فتنہا
چرخ گردان آسیا ہست و ہم پرویزن ست

وہم مستی بسکہ چشمت را غبار آلود کرد
تا تو می بینی مرا من نیستم گردِ من ست

موسیا وارفتگان گفتگوے یار را
در صداے لن ترانی موج برق ایمن ست

کاروان اشک خون زین رہ گذر بگذشت دوش
نقش پایش از سرِ موے مژہ تا دامن است

نکہت گل را بگفتم رخ ہمی پوشی چرا
گفت مےجویم مرا خونِ وفا برگردن ست

از ہجوم ظلمت اندوہ و غم مضطر مباش

بعد شب صبح است و بعد از صبح روز روشن است

ما سراغ حق همی گیریم از نامحرمان
کاندرین وادی چراغ راه چشم رہزن است

درس عبرت را ازین پیر طریقت یاد گیر
چنگ در بزم طرب محو فغان و شیون است

میکشد در رہ ترا این سعی بیجا اے سپند
نردبان دود دل کوته ز بام شیون است

طے کند صد ساله ره از برگ گل تا آفتاب
بهر شبنم این کرامتها ز قلب روشن است

حاصل عمر خود از بهر تماشا سوختی
نظم این جوش طرب رقص شرار خرمن است

۶۰ ولہ ۴

عشق از سوز دل بی طرح آتش خانه ریخت
اخگر از آتش گرفت و در دل پروانه ریخت

کشتهٔ آن ترک مستم کز سر ناز و غرور
کافرم پنداشت و خونم چه بے باکانه ریخت

چاره بے خوابیم ناید ز نواے قصه خوان

درد و چشم صد نمک وان شور این افسانه ریخت

کرد چون خورشید تیغ خونچکانش در نیام
چرخ از شب داغم بگشاد و ز اختر دانه ریخت

۶۱ وله ۱۶

هوس برغم خرد و مدعای دیگر داشت
صوابدید دگر بود رای دیگر داشت

اگرچه خضر رفیق طریق بود ولے
سلوک منزل دل رهنمای دیگر داشت

نه گشته ایم مکدر ز صدمهٔ نفسی
که آب آینه ما صفای دیگر داشت

جهانست صفحهٔ اعمال مرد دانستم
که لغزش قدمم نقش پای دیگر داشت

صعود کردم تا لامکان و برگشتم
که گوشهٔ دل روشن فضای دیگر داشت

دلم اگرچه بخود هرچه کرد بد کردست
ولے خیال نکوئی بجای دیگر داشت

مگو که ناله کشیدیم و بر نخواست صدای
شکست گنبد مینا صدای دیگر داشت

ز کنج صومعه این جا رسید برخوردم
که کنج میکده آب و هوای دیگر داشت

بجرم عشق تو کشتی مرا و شاد شدم
چرا که کشته تو خونبهای دیگر داشت

مپرس حال ز خود رفته براه فنا
که جادهٔ دگر و نقش پای دیگر داشت

به زعم من همه بودیم طالب دوست
براه فتنه فتادن بنای دیگر داشت

به بزم عیش همه دل به شکوهای فراق
حکایت شب غم ماجرای دیگر داشت

بوهم رشک بهفتیم و باز گردیدیم
که راه کوچهٔ او نقش پای دیگر داشت

متاع هوش بباد فنا بداد و گذشت
اگر به بدن زنگم هوای دیگر داشت

به پند ناصح ناداں که گوش ننهادم
کلام او به سخن نارسای دیگر داشت

فریب نغمهٔ بلبل نخورده ام ای نظم
ز خامه ام نفس مشکسای دیگر داشت

۶۲ ۱۲

زکنه واجب اوار هیچ نتوان گفت
هر آنچه گفت کسی با بجد امکاں گفت

غم تو در دل من آنچه گفت پنهاں گفت
بیان جمع بدانم چه چشم گریاں گفت

هر آنچه گفت گل از خواب خود پریشاں گفت
ز بزم گلکده پژمان برفت و خنداں گفت

به شاهراه طلب وقف سعی را نازم
که مشکلی که بر او عرض کردم آساں گفت

ورود لشکر و وادی نمل و مور ضعیف
ز هیبتش نتوان هیچ با سلیماں گفت

اماں ز باد فناییست در حصار سپهر
چراغ مهر شنیدی چه زیر داماں گفت

چه خواست تیر نگاهش ز من نه دانستم
که هرچه گفت هم از زبان پیکاں گفت

زهی مروت ابر و زهی استغناش
صلا بخواں کرم برشنیده اماں گفت

ز عشق ضبط فغاں طرفه لذتی دارد
حکایتیست که نتواں شنید و نتواں گفت

غزل اگرچه لگلبانگ بلبلی ماند
هزار نکته در و شاعر سخنداں گفت

حکایتی ز تماشای بزم و حاصل دید
که شمع کشته بگفت از زبان مژگاں گفت

کسی چه گوش نهد بر بیان نظم بحشر
که خواب هستی خود گفته و پریشاں گفت

۶۳ — وله — ۱۱

کامگار است هر که ناکام ست — زانکه گیتی طلسم اوهام ست
بدنگو هر که را که بدنام ست — نام او خود بجائے دشنام ست
فال باده کشی حزن واعظ — خط پیمانه حلقهٔ دام ست
دین و دنیا بهم نخواهد رفت — طمعے هست و سر بسر خام ست
انفعال گناه و حسرت دید — چشم بر پا و جلوه بر بام ست
گردبادیم و راه کوچهٔ دوست — نیت ما طواف و احرام ست
آستانش کجا و سجدهٔ ... ما — بوسهٔ عاشقاں به پیغام ست
اصل گیتی ست جوش بادهٔ عشق — کهکشاں حلقهٔ خط جام ست
جست از جا سپند و رمزے گفت — کز عدم تا وجود یک گام ست
بنده آں کسم که در عالم — نیک کردار و نیک فرجام ست

نظم دانسته ام بنا عمر سپهر
صبح آغاز و شام انجام ست

۶۴ — قطعه — ۵

مرکب ماست کوکب سیار — از مسیرش سنین و اعوام ست
او دریں راه خویش غلطنده — شام تا صبح صبح تا شام ست
تا هلال از هلال یک منزل — تا صباح از صباح یک گام ست

گه قریب است و گه بعید از شمس　　قرب و بعدش فصول ایام است
هر چه بینیم ما همی بینیم　　که زمین فرش و آسمان بام است

۶۵ مشاعره صدر اعظم بهادر ۹

دل همه زخم و دور زلفش شکن اندر شکن است　　در خم هر شکنش نافهٔ مشک ختن است
تو بهار است که پری خانه به مینا دارم　　جنبش بال پری موج شراب کهن است
رفت عمر و ز چمن دور و اسیر قفسم　　در دلم نقش هواخواهی سرو و سمن است
خواستم نافه ز زلفش بگشایم در باغ　　گفت هشیار که غماز نسیم چمن است
بسکه بگریختم از صحبت ابنای زمان　　بر سرم گرد غریب الوطنی در وطن است
ابر بر کوه ز غم تو می گرید زار　　برق از این ره که تو غافل گذری خنده زن است
قبرها بود زمین غرق بخون ناحق　　شاهد راز درون لالهٔ خونین کفن است
غزل شاد که سلک گهرش می گویند　　شهرهٔ حسن قبولش ز دکن تا عدن است
برتری از دگران اهل سخن را است بجا　　جوهر ذاتی انسان سخن است و سخن

۶۶ دله ۷

آورد عرض بار امانت چنان شکست　　پشت سپهر تا کمر کهکشان شکست
موجی چو سیل سر زده از قلزم شهود　　در وادی سپهر کران تا کران شکست
سوز فراق و گریهٔ شبهای تار حیف　　بنیان شمع از قطره تا استخوان شکست
پیر مغان براه کرم جرعه بداد　　کز وی خمار هستی من جاودان شکست

خم گشت پشت مرد و بدل آرزو بماند | تیر کش ہنوز نا شدہ خالی کمان شکست
این قید و بند بود پے مرغ روح من | تا من رہا شدم قفس استخواں شکست
مرغے بہ پیش ابرہہ رفت و صدا نکرد | از سنگ ریزہ گردن پیل دماں شکست

٦٧ ——— ١٩

حرف ح

دور کھینچے نہ گریباں کی طرح | ٹوٹ جاؤنگا میں داماں کیطرح
پاؤں پھیلائے ہیں داماں کیطرح | ہاتھ کھینچا ہے گریباں کیطرح
چل گیا مجھ پہ یہ دوھرا خنجر | پھر گئی آنکھ بھی مژگاں کیطرح
تیرے عاشق کا یہ دل تھا ظالم | توڑ ڈالا جسے پیماں کیطرح
سر جھکا کر نہ اٹھایا ہم نے | تیغ آئی تیرے احساں کیطرح
میرے غماز کا ہے منہ کالا | میرے ہی نامۂ عصیاں کیطرح
کھاتے ہیں ترک محبت کی قسم | ہاتھ اٹھاتے ہیں وہ قرآں کیطرح
اے قناعت ترے صدقے ہو جاؤں | ہیں ہوا پر ہوں سلیماں کیطرح
پر کدورت ہے دل زار ایسا | خاک اوڑتی ہے ساماں کیطرح
مجھ کو حیرت ہے کہ خورشید بھی ہے | زرفشاں جلوہ عثماں (خلد اللہ ملکہ) کیطرح
نظم کے پاس تھا کیا دل کے سوا | کھو دیا اس کو بھی ایماں کیطرح

کیا تھا ابر نے نالہ میری فغاں کیطرح
زمین نکل گئی قدموں سے آسماں کیطرح

الٰہی آج کا ابر اسقدر تو جھک آئے
کہ ڈھانک لے درِ میخانہ سائباں کیطرح

دکھا رہی ہے مجھے بیخودی نیا عالم
جو اس زمیں کیطرح ہے نہ آسماں کیطرح

کوئی نشاں نہ ملا کسطرف گئے احباب
بھٹکتے رہ گئے ہم گرد کارواں کیطرح

نزول رحمت باری ہے آج کثرت سے
کہ ابر کشتی مے پر ہے بادباں کیطرح

دل و جگر کبھی کاہیکو یوں نہ تھے
نہ جانے کس کی نظر لگ گئی سناں کیطرح

جہاں میں صاحب ہمت کی یہ نشانی ہے
عروج پائے جھکے پیر آسماں کیطرح

سوا نمود کے ہستی دہر کچھ بھی نہیں
یہ حلقہ ہیچ سے خالی ہے کہکشاں کیطرح

١٠

٦٨

اس مہینہ میں کہاں تھا ساقیا اچھی طرح
آ۔ ادھر آ عید تو مل لیں ذرا اچھی طرح

انگلیاں کانوں میں رکھکر اے مسافر سن ذرا
آرہی ہے صاف آوازِ درا اچھی طرح

چشم موسیٰ لا سکی اک بار اوسکی جلوہ کی نہ تاب
چشم دل ہے جسکو دیکھا بارہا اچھی طرح

فاصلہ ایسا نہیں کچھ عرش کی زنجیر سے
کیا کہوں اٹھتا نہیں دست دعا اچھی طرح

اہل صورت کو نہیں ہے اچھی سیرت سے غرض
اچھی صورت چاہئے اچھی ادا اچھی طرح

قدر دان لالہ و گل کی خبر لائی ہے کچھ
سال بھر کے بعد آتی ہے صبا اچھی طرح

سیکھ لیگی دل کی بینا ما گر آنے تو دو
بل ابھی کرتی نہیں زلف دوتا اچھی طرح

شیشہ و جام و سبو بھر لے مے گلرنگ سے
آج ساقی گھر کے آئی ہے گھٹا اچھی طرح

لیتے ہیں اہل جنوں کیا کیا تصور کے مزے
آنکھ سے پریوں کو دیکھا بارہا اچھی طرح

دے رہی ہے اسکی خاموشی صدا دو بدوش
یہ نہیں کہتا کہ نظمِ مبتلا اچھی طرح

۶۹ ## حرف خ ۱۲

سمجھا ہوں عیش و طیش جہان خراب تلخ
ہے جام واژگوں میں فلک کے شراب تلخ

دنیا کو آنکھ بھر کے نہ تھا دیکھنا تجھے
ہستی کا ایک جام بھی ہے مثل حباب تلخ

پیری سے بڑھکے عہد کوئی بے مزہ نہیں
شیریں تھا گو زمانہ طفلی شباب تلخ

آیا تھا باغ دہر میں کیا جانتا تھا میں
گزرے گا زندگی کا زمانہ خراب تلخ

پیتا ہوں ڈگڈگا کے تو بڑھتی ہے تشنگی
پیاسا سا کنار بحر ہوں مثل سراب تلخ

بے منت حریف جو حاصل نہ ہو سکے
ہے شیر ناب بے مزہ اور شہد ناب تلخ

سمجھو نہ کس طرح سے کہ شیریں ہیں تیرے لب
ہم نے تو ہر سوال کا پایا جواب تلخ

ناصح فسانہ کہنے میں اگلا ہے تو نے زہر
سن سن کے ہو گیا میری آنکھوں میں خواب تلخ

اک دن جو ہو اداس تو محفل اداس ہے
جام شراب تلخ ہے شور رباب تلخ

سمجھا ہوں جو کہ جنت و دوزخ سے ہم اور
یعنی کہ ہو کرم ترا شیریں عتاب تلخ

پوچھو زبان شمع سے کیونکر ملا فروغ
ہوتی ہے جانگداز ہی راہ صواب تلخ

اے نظم جانتا ہوں فریب جہاں کو میں
پیاسے گئے ہیں مذاق میں موج سراب تلخ

۱۸ ۱۱

حرف د

نظر پڑا جو مجھے دام مشک بو صیاد
ہوئی ہر دل کو اسیری کی آرزو صیاد

نہ بوئے گل سے غرض ہے نہ صوت بلبل سے
وہ باغباں ہے مخالف ہے عدو صیاد

چمن میں خوف اسیری کا ہر طرف تھا ہجوم
نکل سکی نہ مرے دل سے آرزو صیاد

یہ آرزو بھی نہ پوری ہوئی اسیری کی
سنائیں اپنی کہانی سنے جو تو صیاد

جو گل فروش ادا ہی تو بوسہ ہی گلچیں
وہ آج صید میں اور جوش آرزو صیاد

کیا ہی لطف اسیری نے مست بلبل کو
قفس ہے کیا مجھے گلرنگ کا سبو صیاد

لپیٹ کے سرو سے قمری یہ ہی تو کہتی ہے
پھری تلاش میں پھرتے ہیں کو بکو صیاد

گرہ ہوئی ہیں ارے ڈر سے جا بجا نالے
گلوئے نے کی طرح ہے مرا گلو صیاد

قفس میں یاد چمن کی یہ گل کھلاتی ہے
بنا ہی لالہ و گل خون آرزو صیاد

فغاں نہ کر کہ یہیں گھٹ گھٹ کے ہیں تمام ہوا
گلے کی ہو گئی پھانسی رگ گلو صیاد

ہمیں تو اپنی رہائی سے یاس ہے ذوقؔ
کہ ہے غضب کا فسوں ساز و حیلہ جو صیاد

۱۷ ۱۰

آئینہ از پرتو او وادی ایمن شود
چشم آہو از نگاہش دیدہ روزن شود

حیف ازاں ساعت کہ خود نفس تو آہرمن شود
خوشتر آں کس گور ہا از بند ما و من شود

عشوہ او تیغ چوں بر من کشد ہنگام وصل
از دو گیسویش گرہ بکشائم و جوشن شود

اے کہ شمع مدفنم گشتی توقف کن کہ تا
شمع کشتہ باز از سوز دلم روشن شود

اف ازیں سوز نہانیہا کہ دل را خاک کرد
ہمچوں آں پرکالۂ آتش کہ در گلخن شود

نیست امکاں مفر از کوچۂ گیسوے او
جادہ بر خود بپیچد و چوں افعیم رہزن شود

مایۂ صد گمرہی باشد دل صد آرزو
رہگزارش را چراغ از چشم آہرمن شود

کس نمی پرسید از حال من اے برق بلا
خندہ بر من زدی اے چشم تو روشن شود

بادیہ گردی من پوشید عریانی من
گرد رہ در ہر قدم برخیزد و دامن شود

لذتے دارم چناں از کاوش مژگاں تو

بشکنم نشتر بدل گر اهلِ شیون شود

۷۲ ۱۲

جوشِ سرشک تا سرِ مژگان نمی رسد
و از خونِ دیده گل بگریبان نمی رسد

بالا نرست جلوهٔ او از فرازِ عرش
آنجا نگاهِ موسیِ عمران نمی رسد

تا آنکه خود فنا نشود در رهِ طلب
شبنم به اوجِ نیّرِ تابان نمی رسد

ابرِ سیاه در نظرِ جذبِ شوقِ ماست
این گرد سرمه تا به صفاهان نمی رسد

زنجیرِ عرش هست و ندانم ز بهرِ چیست
آنجا که دست سلسله جنبان نمی رسد

دیدند اهلِ دل ثمرِ قدکشیِ سرو
آری سرِ غرور به سامان نمی رسد

تا دست و پا بموجِ تبسم نمی زند
طفلِ شگوفه تا گلِ خندان نمی رسد

دور کاروان و هر بند بند یوسفی
گرچه برآمد است و بزندان نمی رسد

دامن کشان گذشت سرِ کشتگانِ خویش
دستِ کسی بگوشهٔ دامان نمی رسد

مائیم و طوفِ دشت و بیابان چو گردباد
وین خاکِ ما بعمرِ گریزان نمی رسد

بی راهبر مباش که این کاروانِ گل
بی سعیِ نامیه به گلستان نمی رسد

هر چند تیز گرد بود دانهٔ شبه
اما بآبِ گوهرِ غلطان نمی رسد

بدامِ این نفس از افسون نه از افسانه می آید
چنین کارِ سترگ از همتِ مردانه می آید

بیک اشک ندامت مزرعہ اخلاص شاداب است
سر شاخ مژہ خرمن بدوشِ ایں دانہ می آید

دہد تا فشردہ جام صبوحی مے پرستاں را
بیک شب گیر ابر از کعبہ تا میخانہ می آید

اگر ضبطِ نفس شرط است در میخانہ عرفاں
کہ بے قلقل شراب از شیشہ در پیمانہ می آید

عیاں از اہتزاز شعلہ شمع است ایں معنی
ہوائے خوش زباں افشانی پروانہ می آید

براہ دوست عاشق از سرِ جاں بگذرد آرے
بسر غلطیدنی از گوہر یکدانہ می آید

فغاں از مستی ساقی کہ دیدم کشتی مے را
کنار جو بموج لغزش مستانہ می آید

دریں زنداں تن از دم شمردن نہا نیاسایم
نسیم جانفزا از کوچۂ جانانہ می آید

سزد گر سر کشد از بندگی نفس
بشر در عالم ایجاد آزادانہ می آید

ز حد خود گذشتن نیست کار بادہ پیمایاں

که جوشِ باده این جا تا خطِ پیمانه می آید

بگردون تیره ابرے بر شد و مستند میخواراں
که پندارند بر دوش ہوا میخانه می آید

ز احوالِ سویدائے دلِ مضطر چه می پرسی
که چوں اسپند در پرواز بیتابانه می آید

ز پاسِ وضعِ رنداں نگزرم تا اندریں محفل
اقامت از صراحی گردش از پیمانه می آید

فروغِ حسن را شد ناگزیر اسبابِ رسوائی
که ہر جا شمع روشن می شود پروانه می آید

کلامِ بے ہنر کز گنجِ معنی ہست بے بہره
صدائے بوم را ماند که از ویرانه می آید

نمی آید ز ہر کس رام کردن نفسِ سرکش را
چنیں کارِ سترگ از ہمتِ مردانه می آید

فرامش تا کنم اے نظمؔ از دل گریۀ مینا
بگوشِ من صدائے خندۀ پیمانه می آید

حرف ر

فاعلن فعلاتن مفاعلن فعلات

نگاہِ ناز سے بسمل گر نکلے بسمل پر
یہ وہ خدنگ ہے آ آ ہی چھوٹتے دل پر

نظر ٹھہرتی نہیں روئے یار کے تل پر
چمک رہا ہے ستارہ سا ماہِ کامل پر

جہاں کی یہ ہلی مصیبت ہے گردشِ فلکی
وہ بحر ہے کہ بھنور پڑ رہا ہے ساحل پر

پلک جھپکنے میں ہے منہدم بنائے جہاں
کھڑی ہوئی ہے عمارت یہ آنکھ کے تل پر

نوائے شادی و غم دونوں تھی دوش بدوش
کہ پس گیا گلِ نغمہ کفِ حلاحل پر

کیا تھا میں نے ابھی طے نہ وادیِ غربت
کہ پہونچی شامِ غریباں سوادِ منزل پر

ہمیں تو قلزمِ ہستی سے تھی عبور کی فکر
نہنگ بن گئی ہر موج آ کے ساحل پر

ملی نہ غمکدۂ دہر میں جگہ اتنی
کہ روؤں بیٹھ کے میں نامرادیِ دل پر

اوتر کے بام سے آیا نہ پھر وہ رونقِ بزم
وہ نور پھر کبھی اترا نہ شمعِ محفل پر

چلی ہے دہر میں کیسی ہوائے بیدردی
کہ ہو رہی ہے ہنسی نالۂ عنادل پر

تو ہم سے سیکھ لے اے قیس طرزِ بیتابی
اتار لیتی میں لیلیٰ کو چڑھ کے محمل پر

اولجھ کے دورِ تسلسل میں رہ گئی جو نگہ
او نہیں ہے رشکِ سر طوق اور سلاسل پر

پکارتی ہے یہ حسرت کہ ذبح کرکے مجھے
دیا ہے خون کا ٹیکہ جبینِ قاتل پر

جو یاد آ گئی ہے میرے دل کی بیتابی
پھڑک رہی ہے یہ وہ اندازِ مرغِ بسمل پر

نہ پوچھو قافلہ والو یہاں کا کوچ و مقام
کہ اک رکاب میں ہی پاؤں ایک منزل پر

یہ بے ثباتیِ سازِ طرب پکارتی ہے
کہ نغمہ رنگِ حنا ہے کفِ جلاجل پر

طوافِ شوق کو سیکھو انہیں پتنگوں سے
تڑپ رہے ہیں جو گر گر کے شمعِ محفل پر

نہیں مقام کا اس جلیتی چھپاؤ نہیں موقع
نہ بیقرار ہو مرنا پہنچ کے منزل پر

ملا طریق وفا میں جو کوئی سنگ گراں
اٹھا کے راہ سے ہم نے وہ رکھ لیا دل پر

نگاہ ناز کا مطلب ہے کیا نہ کچھ سمجھا
چھری جگر پہ کوئی اب لگائے یا دل پر

ہزار شکر کہ افعال میں تو جبر نہیں
ہزار حیف نہیں اختیار ہے دل پر

لگا دے تیر کے پر مجھ کو بیقراری دل
کہ منہ کے بل میں گروں جا کے اپنی قاتل پر

ہے غبار کو جھٹکو نہ قافلے والو
کہ ٹھوکروں میں پہنچ جائیگا یہ منزل پر

کسی کو قبر میں بھی پھر نہ پائیگا کوئی
کہ تین دن کے ہیں مہمان یہ پہلی منزل پر

کجا وہ جلوہ گہ ناز تو کجا اے نظم
یہ آرزو تجھے اس حوصلہ یہ اس دل پر

۵۷ —— فاعیل مفاعیل مفاعیل مفاعیل —— ۱۷

کوچہ کوئی نکلے جو رگ جاں کے قریں اور
اس گنبد بے در سے نکل جائیے کہیں اور

ہو سکتا ہے عالم میں جو ہو مہر مبیں اور
تجھ سا تو تصور میں بھی عالم کے نہیں اور

دل لیکے ستمگار ہوا ہر سر کیں اور
دل جان تو ڈر ہے کہ وہ بگڑے نہ کہیں اور

اللہ رے ساقی کا بجد ہو کے بلانا
کہتا ہوں میں بس بس تو وہ کہتا ہے نہیں اور

زاہد ہو مرے اور ترے سجدہ میں بڑا فرق
شوق اور ہوس اور ہے دل اور ہے دیں اور

کوثر پہ بھی زمزم پہ بھی گذرا ہے تو واعظ
دیکھے ہیں کہاں ہم سے خرابات نشیں اور

خط لیکے جو قاصد ترا آیا تو میں سمجھا
لائے ہیں صحیفہ کوئی جبریل امیں اور

اس چھیڑ میں کوئی جو نہ مرتا ہو تو مر جائے
وعدہ ہی کہیں اور ارادہ ہی کہیں اور

او، قاتل بے رحم کوئی وار ادھر بھی
محروم رہا جاتا ہی اک خاک نشیں اور

مر کر بھی ہمیں صور قیامت کا ہی دھڑکا
باقی ہی ابھی اک نفس بازپسیں اور

مرقد میں گڑا جاتا ہوں میں بار گنہ سے
جھکتا ہی جو گردوں تو دباتی ہی زمیں اور

وہ داغ جو قسمت میں لکھا ہی نہیں مٹتا
گھستا ہی جبیں سا تو مٹتی ہے جبیں اور

اوڑنے میں لپکنے میں ہی شعلہ ترا توسن
ہی قہر کہ دیتا ہی ہوا دامن زیں اور

خوشبو سی یہ بہتی ہی شب وصل کی شب تھی
گیسو ہوئی برہم تو کھلا نافہ چیں اور

کوچہ میں ہی تیرے غم عالم سے ہائی
پاتا ہوں ہوا اور فلک اور زمیں اور

تیر نگہ ناز نے کیا تفرقہ ڈالا
میں ہوں کہیں بسمل جگر و دل ہی کہیں اور

وہ محفل ارباب صفا ہو گئی برہم
ان لوگوں میں باقی ہی اب اک نظم خیر اور

۷۶ ——— فاعلین فاعلات م فاعیل فاعلات ——— ۱۵

احسان لے نہ ہمت مردانہ چھوڑ کر
رستہ بھی چل تو سبزہ بیگانہ چھوڑ کر

مرنے کے بعد پھر نہیں کوئی تہ فلک
جاتا ہی شمع کشتہ کو پروانہ چھوڑ کر

ہونٹوں پہ آج تک ہیں شب عیش کے مزے
ساقی کا لب لیا لب پیمانہ چھوڑ کر

افعی نہیں کھلی ہوئی زلفوں کا عکس ہے
جائے کہاں ہو آئینہ و شانہ چھوڑ کر

طول امل پہ دل نہ لگانا کہ اہل بزم
جائیں گے ناتمام یہ افسانہ چھوڑ کر

لبریز جام عمر ہوا آ گئی اجل
لو اٹھ گئے بھرا ہوا پیمانہ چھوڑ کر

اس پیر زال دہر کی ہم ٹھوکروں میں ہیں
جب سے گئی ہے ہمت مردانہ چھوڑ کر

پہروں ہمارا آپ میں آنا محال ہے
کوسوں نکل گیا دل دیوانہ چھوڑ کر

اونزا جو شیشہ طاق سے زاہد کا یہ خیال
کرتا ہے رقص سجدہ شکرانہ چھوڑ کر

یہ سبحۂ و ریا تو نشانی ہے کفر کی
زنار باندھ سبحۂ صد دانہ چھوڑ کر

زندان میکدہ بھی ہیں اے خضر منتظر
بستی میں آئیے کبھی ویرانہ چھوڑ کر

احسان سر پہ لغزش مستانہ کا ہوا
ہم دو قدم نہ جا سکے میخانہ چھوڑ کر

وادی بہت مہیب ہے بیم و امید کا
دیکھیں گے شیر پہ دل دیوانہ چھوڑ کر

رو رو کے کر رہی ہے صراحی وداع اور
جاتا ہے دور دور جو پیمانہ چھوڑ کر

توبہ تو کی ہے نظم بنا ہو گی کس طرح
کیونکر جیو گے مشرب رندانہ چھوڑ کر

۱۵ ۲۲

بت کہتے ہیں کبھی تصویر دیکھ کر
سوجھی ہے دل لگی مجھے دلگیر دیکھ کر

بندۂ آئینہ سے بھی پردہ کیا کرو
ڈرتا ہوں میں نگاہ میں تاثیر دیکھ کر

پہلو سے وہ گھڑی نہ سرکتے تھے جو کبھی
گھبرا رہے ہیں وہ فن تاخیر دیکھ کر

سایہ کے ساتھ دھوپ بھی شرما کے مٹ گئی
زلفوں میں روئے یار کی تنویر دیکھ کر

عالم سے مجھکو صانع عالم کی یاد ہے
معمار کا خیال ہے تعمیر دیکھ کر

سمجھے مری دعا کو ملک نردبان عرش
پیہم صعود نالۂ شبگیر دیکھ کر

دوزخ میں اے کریم میں کیونکر گلہ کروں
تعزیر دی تو لائق تعزیر دیکھ کر

نالہ کی اپنے بے اثری یاد آگئی
تڑپا ہیں صید کو ہدف تیر دیکھ کر

گردوں یہ ہے حداثتِ سن کا یقین مجھے
پیہم یہ انقلاب یہ تغییر دیکھ کر

وہ ہیں غرور حسن سے ضحاک روزگار
شانوں پہ اپنے زلف گرہ گیر دیکھ کر

سفاک خلق تجھ کو خدا نے بنا دیا
اہل جہاں کو لائق تعزیر دیکھ کر

خالق عطا کرے مجھے دیوانگی عشق
آنکھیں بچھاؤں حلقۂ زنجیر دیکھ کر

جب دل الٹ چکا تو ہوئے ہیں وہ مہرباں
اب کڑھ رہے ہیں پاؤں میں زنجیر دیکھ کر

میرا گلا ہے ہاتھ مرا ان کو کیا غرض
بازو سے کیوں لپٹ گئے شمشیر دیکھ کر

اے نظمؔ مجھ کو فلک کے ستم کا گلہ نہیں
کرتے ہیں شکر خواہش تقدیر دیکھ کر

۷۸ ——— فعلاتن فعلاتن فعلاتن فعلات ——— ۱۷

مجھ کو یارب تو عطا کر دل نالاں دوچار
دل ہوں دوچار تو ہر دل میں ہوں ارماں دوچار

اے جنوں مجھ کو دکھا عالم امکاں دوچار
شش جہت کو میں سمجھتا ہوں بیاباں دوچار

گیسوؤں میں ہے شب وصل کا نقشہ باقی
کچھ گندھی رہ گئیں زلفیں تو پریشاں دوچار

میں ہوں وہ کشتۂ حسرت کہ لحد پر میری
اڑتے پھرتے ہیں حسینوں کے گریباں دوچار

شادی و غم کو یہ مانا کہ بہم ہیں لیکن
نہ تو ہم تھے نہ کیا کچھ نہ کہا کچھ ہم نے
سایۂ سرو میں بیٹھے ہیں کہ آزاد ہیں ہم
رات اندھیری تھی مگر سیکڑوں تارے ٹوٹے
ایک دانہ کی گرہ میں ہیں بہت سی خرمن
لاکھ صدمے ہوں مگر عشق کا ایسا ہی مزا
کیا ملا تجھکو صبا پھول کے غنچہ کی گرہ
اتنے فرقے ہوئے کس طرح مسلمانوں کے
اپنے ساحل پہ جگہ دیتے ہیں اے بحر کرم
پیکر خاک کجا اور کجا عقل و حواس
غم سے کیوں زرد ہی تو دیکھ تماشائے جہاں
کوچۂ تنگ میں ہیں سیکڑوں مضمون کی صفیں

سیکڑوں دہر میں گریاں ہیں تو خنداں دو چار
تہمتیں چند لگانی گئیں بہتان دو چار
کاٹ دینگے اسی کملی میں زمستان دو چار
آئے تھے خون کے آنسو سر مژگاں دو چار
ایک غنچہ کی بغل میں ہیں گلستاں دو چار
کہ ہزاروں میں ہوئی ہونگے پشیماں دو چار
نکلے دو چار جو دامن تو گریباں دو چار
یہ تو معلوم ہے اوترے نہیں قرآں دو چار
تشنہ لب جھیل کے آئے ہیں بیاباں دو چار
اوترے ہیں منزل خاکی میں یہ مہماں دو چار
رنگ بدلے گی ابھی گردش دوراں دو چار
میرے خامہ کیلئے چاہیے میداں دو چار

اس زمیں میں کہے ہیں اشعار میں حاصل اے نظم
آسماں بھر میں ستارے ہیں درخشاں دو چار

۴۹ ——— ۲۶

رو دئے ناصح بے درد کے سمجھانے پر
ناز کرتا ہے فلک ظلم و ستم ڈھانے پر

ہنس دئے راز غم عشق کے کھل جانے پر
اور زمیں پاؤں کے نیچے سے نکل جانے پر

تف ہے اے دور فلک اس ترے ہنجار پر — رشک ہے خضر کو سقراط کے پیمانہ پر

نہ تو یاروں پہ بھروسہ ہے نہ یارانہ پر — دیکھ دھوکا نہ یگانہ کا ہو بیگانہ پر

مجھ کو چھٹکے ہوئے تارے نہ دکھا اے گردوں — طائر عرش ہوں گرتا نہیں ہر دانہ پر

سعی سے باز نہ آ آب رواں کے مانند — نقش تدبیر کا بن بن کے بگڑ جانے پر

حیف چھاتی پہ سلاطین کے دھرے ہیں پتھر — خس کی ٹٹی نہ ہوئی قبر کے تہ خانے پر

نہ تسلط ہے کسی کا نہ مزاحم کوئی — سو خزانے ہوں تو صدقہ کروں ویرانہ پر

سلسلہ خواب پریشاں کا ہے بیداری بھی — ہوش آیا نہ ہمیں ہوش کے بھی آنے پر

نہ ملی موج حوادث سے تہمتن کو پناہ — تیغ یہ رکھی ہے جوشن پہ نہ دستانہ پر

حرص کیوں آئے یہاں تو ہے قناعت پہ گذر — کہہ دو تمیمی کا ہے ہمسایہ مرے کاشانہ پر

کس طرح میں نہ تری دام میں آلجھوں صیاد — کہ مرا نام تھا لکھا ہوا ہر دانہ پر

چونکو ہشیار ہو اے سایہ میں سونے والو — اب تو عبرت ہو تمہیں دھوپ کے ڈھل جانے پر

سو سخن شہر خموشاں میں لب گور پہ ہیں — ہمکو ہوتی نہیں عبرت کسی افسانے پر

سرکشو گور غریباں میں یہ کیا حال ہوا — سر اوٹھایا نہ کبھی پاؤں سے ٹھکرانے پر

کچھ نہ اندیشہ عقبیٰ ہے نہ فکر دنیا — رشک کس طرح نہ عاقل کو ہو دیوانہ پر

اس زمانے میں نجانے تو کہاں تھا واعظ — دل کو جب ناز تھا قابو سے نکل جانے پر

کاسہ گر نے تو نہ پائی کہیں جمشید کی خاک — نام لکھا ہے تو لکھا رہے پیمانہ پر

جانفشانی میں اور انداز پر افشانی میں — رشک پروانہ کو مجھ پر مجھے پروانہ پر

بادہ خواری کا بُرا ہو کہ ہی اوقات اب تو
مے گرے گر جانے پہ ساغر کے چھلک جانے پر

نامۂ شوق کا طومار تو پڑھ کر دیکھو
رقص کرتا ہے کبوتر مرے افسانے پر

اے نسیم سحری کس سے یہ سیکھی ہے ادا
چاک ہوتے ہیں گریباں ترے اٹھلانے پر

زر فشاں ہونے کو ناحق نکل آیا خورشید
ابر آمادہ تھا چمن باغ میں برسانے پر

کیا خبر کون ہیں بیہوش یہاں آپ ہیں کون
وہ بھی دیوانے ہیں جو ہنستے ہیں دیوانے پر

ہمہ تن گوش ترے ہیں گل مگر اے مرغ چمن
کان رکھتا بھی ہے کوئی ترے افسانے پر

ایک جلوہ کے سوا کچھ بھی نہ دیکھا اے نظمؔ
بیخودی بزم میں چھائی رہی پروانے پر

٨٠ ٨١

وہ وش پر تیر ہیں افعی کبھی رخسار و نیر
خود ستمگر ہو عنایت ہے ستمگاروں کے

تاک انگور درختوں پہ چڑھی تھی کمر تک
آج تو پھاند پڑی باغ کی دیواروں کے

بھیڑ کی تھی لب جاں بخش کا شہرہ سن کر
چشم فتاں نے چھری پھیر دی گلی زناروں کے

میں وہ نالاں ہوں کہ ہو جن کی صدا او
ہاتھ دوڑاؤں گریباں کے لئے گر تاروں کے

رحم مجھ پر تو نہ آیا تجھے مرتے مرتے
مہربانی ہے یہ کیوں میرے غزاداروں کے

یا نہیں گھر دشمن مری قوالی ہے تو دکھی شراب
منہ جو پوچھوں بھی تو ملکر تری رخساروں کے

تلف عمر یہ زاہد ہے پریشاں کیسا
دیکھا رحمت کو تو آئے جو گنہگاروں کے

جوش سودا میں یہ آتش قدمی تو دیکھو
کہ میں شعلہ کی طرح دوڑتا ہوں خاروں کے

رکھتے ہیں ابرو و عارض صفتِ تیغ و ترنج
لو چھری پھر گئی یوسف کے خریداروں پر

ہوس لذتِ بیداد نہ پوچھو مجھ سے
دل جب آتا ہے تو آتا ہے دل آزاروں پر

لطف یہ ہے ابھی کھینچی نہیں اُسنے تلوار
ٹوٹے پڑتے ہیں گنہگار گنہگاروں پر

باغ سے قوس قزح کی نظر آتی ہے طناب
خیمہ زن ابر ہوا آکے جو کہساروں پر

ہو گیا مستوں کی جھرمٹ میں جو خورشید غروب
سرخ ہیں رنگ شفق پھولی ہے رخساروں پر

سختیاں عشق کی جسطرح سے جھیلیں گے
ہم نے دیکھی ہے تجلی انہیں کہساروں پر

بڑھ گئی کس کی سواری فلک ششم سے
رشک جبریل کو ہے غاشیہ برداروں پر

جب سے دیکھا تجھے انگشت شہادت کی طرح
انگلیاں اٹھتی ہیں یوسف کے خریداروں پر

میرے نالوں کو جو کوٹھے پہ نہ آنے دوگے
چاندنی نکلے وہ رہ جائیگا دیواروں پر

دل تڑپتا ہے یہ شاید کسی دیوانہ کا
آج کوندا نظر آتا ہے جو کہساروں پر

لالہ پھولا تو یہاں آنکھوں میں سرسوں پھولی
بیخودی چھائی گھٹا دیکھ کے گلزاروں پر

سختیاں طالب دیدار اٹھاتی ہیں عبث
ٹھوکریں کھا چکے موسیٰ نہیں کہساروں پر

نالے سو ہی فریاد ہی بیکار ہیں نظم
رحم آئیگا نہ ظالم کو گرفتاروں پر

۱۶ ۸۱

کروٹوں میں ہے رہا پھولوں کی شامل نکہت کیونکر
مُنہ دیکھا بہار کی کلیوں میں مرا دل کیونکر

جذبِ دل کھینچ تو لے لیلیٰ و سلمیٰ کو بہم
دیکھیں تو آتی ہے محمل میں محمل کیونکر

گورے گالوں پہ ٹھہرتی نہیں نظر مشکل سے
پاگئی راہِ فنا تو تو تڑپ کر اے برق
تجھسے تو ضعف سے کروٹ نہیں بدلی جاتی
کسطرح باغ میں بہلیگا دلِ زار اپنا
ہمتِ پیرِ مغاں کی ہیں کرامات یہ سب
تین دن تو رہی ظلمات میں کشتیٔ ہلال
برق رفتار ہی کیا قافلۂ عمرِ رواں
دل کو رکھونگا میں اب باندھ کے زنجیروں میں
موجِ دریا سے یہ عبرت کا فسانہ سن لو
کچھ غبارِ سرِ رہ کو یہ خبر ہے معلوم
کچھ خبر شمعِ فروزاں کو ہی پروانہ کی
دلِ پُر درد تو شیشہ سے سوا ہی نازک
میں ہوں بیمارِ غم اور عمر کی منزل ہی پہاڑ
دورِ گردوں میں ہی بیقدری ہی پامالی

ہیں یہ حیران سبھی کاجل کے بنی تل کیونکر
دیکھیں ملتا ہے ہمیں جادۂ منزل کیونکر
ہوں یہ حیران تڑپتا ہے مرا دل کیونکر
اور سنی جائیگی فریادِ عنادل کیونکر
ابھی خالی تھی ابھی بھر گئی محفل کیونکر
آ گئی ڈوبتی تیرے لبِ ساحل کیونکر
ایک دم میں یہ گیا سیکڑوں منزل کیونکر
دیکھتا ہوں کہ تڑاتا ہے سلاسل کیونکر
کشتیاں ڈوب گئی ہیں لبِ ساحل کیونکر
قافلے لٹ گئے آ کر سرِ منزل کیونکر
ایک جلوہ میں یہ سب ہو گئے بسمل کیونکر
اب کہو صبر کی چھاتی یہ دھروں سل کیونکر
ناتوانی میں کروں قطعِ مراحل کیونکر
جائے حیرت ہے کہ ہمکامہ کا مل کیونکر

۸۲

دھوکا زلفوں نے دیا عنبرِ سارا بن کر
مرضِ عشق میں سو مرتبہ میں مر کے جیا

۸۳

سحر آنکھوں نے کیا نرگسِ شہلا بن کر
پوچھ لو ان سے جو بیٹھے ہیں مسیحا بنکر

ہو گئی زلف پریشاں تو کمر سے اسکی
حلقۂ زلف لپٹ کر لگے چھلّا بن کر

دن بھی نکلا تو بلائے شب فرقت نہ ٹلی
پیچھے پیچھے دوڑا مری سایۂ شب یلدا بن کر

پی لیا تھا جو مرا خون تری ناوک نے
منہ سے سوفار کے نکلا وہ کلیجا بن کر

اسقدر خاک میں پنہاں ہیں بتان مہوش
گردباد اٹھی تو رہ جائے کلیسا بن کر

ہر طرح کی حرکت نام کو ہم رکھتے ہیں
وہ اٹھتے ہیں بیٹھے ہیں نقش کف پا بن کر

اب مجھے صبح قیامت کی بھی امید نہیں
اے فلک سر پہ گرا ہے شب یلدا بن کر

لاکھوں ہی شیشۂ دل نور از احجر ہو گئی
تب یہ تیار ہوا گنبد مینا بن کر

سبحۂ حضرت واعظ نہ تھا مجھکو بیتوں
اک گلا گھونٹ ہی ڈالے گا یہ پھندا بن کر

میری تصویر کھنچی گر تری تصویر کے ساتھ
دیکھ لینا کہ بگڑ جائیگا نقشہ بن کر

باغ تو خوب ہی حسرت نے لگایا ہے مگر
مٹ نہ جائے کہیں دیکھو یہ گھروندا بن کر

خاکساروں کا تری شوق میں اٹھتا تھا غبار
رہ گیا ہے یہ وہی عرش معلیٰ بن کر

کیا ہوا ہے نظم بیاں صبر و قناعت کا مزہ
نعمتیں مجھ پہ یہ اتریں من و سلویٰ بن کر

۸۳ — ۱۲

ور دنداں نہ چھپے صاعقہ افگن ہو کر
یا کنول بجھ گئی الماس کے روشن ہو کر

بھیس بدلے ہوئے رہتی ہے قضا عاشق کی
عشوہ ہو کر کبھی بار کبھی جتون ہو کر

کیا سیاہی شب ہجراں میں ہے کیا تاریکی
رہ گیا شمع کا شعلہ گل سوسن ہو کر

وہ نہیں ہیں تو زمانہ ہے نظر میں اندھیر
شمع منہ اپنا ہی دکھا کے روشن ہو کر

وصل سمجھوں کہ کسی ہجر میں اے بندہ نواز
دور رہتے ہو قریب رگ گردن ہو کر

ہے غرور اہل جہاں سے کہ ملا ہے ہم کو
جادۂ منزل عرفاں رگ گردن ہو کر

نگہ ناز نے تاراج کیا خانۂ دل
چور بن کر کبھی لوٹا کبھی رہزن ہو کر

نامرادی کا میں خوگر تھا بر آئی جو مراد
شکر منہ سے مرے نکلا بھی تو شیون ہو کر

گردشیں چرخ کی سر پر نہ ہوں جن سے مجھے
آ گئے قدموں پہ گریں حلقۂ آہن ہو کر

ماہ نو دیکھ کے اوس ترک کماں ابرو کو
مل گیا خاک میں نقش سم توسن ہو کر

سخت مشکل میں ہے شیخ اُٹھی دیکھ کے حالت ساقی
نالے کرنے لگی زنجیر بھی آہن ہو کر

لکھنؤ گردش گردوں نے چھڑایا ہم کو
دور پھینکا مجھے آخر کو فلاخن ہو کر

۱۵

سر و قد حشر اٹھا قامت دلجو ہو کر
فتنے بیدار ہوئے نرگس جادو ہو کر

شام ہی سے یہ شب عیش کا عالم دیکھا
تا کمر آ گئی طول شب گیسو ہو کر

صبح ہو اے شب عشرت ترے صدقے جاؤں
ڈھانک لے چہرۂ خورشید کو گیسو ہو کر

ستیں یاں رہا ہے مرے سر پہ فلک
سر پہ آئی جو بلا رہ گئی گیسو ہو کر

لب پہ ہے مہر خموشی کی مگر آنکھوں سے
حسرت دید ٹپک پڑتی ہے آنسو ہو کر

حسرتیں دل کی نہ نکلیں مری لیکن نکلیں
کبھی آہیں کبھی نالے کبھی آنسو ہو کر

16

یک بیک پھونک دیا مینھ سے جو آئے شب وصل
شعلۂ شمع اڑا جاتا ہے جگنو ہو کر

دل نہ دنیا سے لگایا کہ ہیں آزادہ روش
چمنستاں میں نہیں بھی تو بسے بو ہو کر

لے گیا عہد جوانی نہ ہمیں ساتھ افسوس
ڈھونڈتے رہ گئے گرد رم آہو ہو کر

راہ میں خشک زراعت تھی نہ دیکھی ابر
کیا برستا ہوا جاتا ہے لب جو ہو کر

لے گئی عرش معلی پہ مجھے فکر سخن
جا پڑی پر تو آئینہ زانو ہو کر

بے سبب قتل کیا پھیر کے چتون اوسنے
چل گئی دل پہ چھری جنبش ابرو ہو کر

آئینہ اس کو دکھاتے جو لگا ہوش سکندر
رہ گیا سکتہ میں وہ سرو لب جو ہو کر

دل اگر ایک طرف ہو تو جگر ایک طرف
تولتی ہے نگہ ناز ترازو ہو کر

مجلس اہل سخن میں نہ اٹھیں گے ہرگز
پاؤں اب توڑ کے بیٹھے ہیں دو زانو ہو کر

قدر ای نظم کسی نے بھی نہ جانی ہرگز
دامن دشت میں مہکا گل خود رو ہو کر

۵ م ——— فاعلاتن فاعلاتن فاعلاتن فاعلات ——— ۱۲

آستینیں تو چڑھائی ہیں مری تعزیر پر
کچھ بتاؤ تو سہی آخر یہ کس تقصیر پر

بانی اس صحرا میں نایاب و رہی زخمی کو پیاس
ایک قطرہ آب اگر دیکھا تو نوک تیر پر

آن ہے جن کی طبیعت میں عجب مشکل پسند ہیں
ہر قدم اس کاروان کا ہے دم شمشیر پر

سعی لاحاصل سہی ہیں باز آنیکا نہیں
ہنسی دو تقدیر ہنستی ہے اگر تدبیر پر

صبر کی تلخی میں بھی لذت ہے وہ واقف نہیں
مکھیوں کی طرح جو گرتے ہیں شہد و شیر پر

دل میں تھا صیاد کے خود صید ہو جانیکا خوف
ٹوپیاں اونچی چڑھا دیں دیدۂ نخچیر پر

پہلے ہو وہ گذر جو تجھ کہے عزم بلند
بعد اسکی کر بھروسا خواہش تقدیر پر

اپنے خرمن پر تسلط دیکھتے ہیں غیر کا
ہے بھروسا ہم کو برق نالۂ شبگیر پر

خوف رسوائی سے اٹھتی ہے صدا جھنکار کی
اگر کسی کی آنکھ پڑتی ہے مری زنجیر پر

خاک کی چٹکی ہے کافی خاکساروں کیلئے
کیا دوا ہر درد کی موقوف ہے اکسیر پر

کہنے سننے کا اثر اغیار پر ہوتا نہیں
آ رہا اہل وفا کا فیصلہ شمشیر پر

جانتا ہوں میں کجا خاک درِ جاناں کجا
نظم مجھ کو ناز ہے اس خوبیِ تقدیر پر

١٨ مفاعلن فاعلن فعولن دوبار ٨٦

ہنسی میں وہ بات میں نے کہدی کہ رہ گئے آپ دنگ ہو کر
چھپا ہوا تھا جو راز دل میں کھلا وہ چہرہ کا رنگ ہو کر

ہمیشہ کوچ و مقام اپنا رہا ہے خضرِ رہِ طریقت
رکا تو میں سنگ میل بنکر چلا تو آوازۂ زنگ ہو کر

نہ توڑتے آرسی اگر تم تو اپنے یوسف نظر نہ آتے
یہ قافلہ کھینچ لائی سارا شکست آئینہ زنگ ہو کر

شباب و پیری کا آنا جانا غضب کا پردہ در ہے فسانہ
یہ رنگتیں بن کے گرد حسرت وہ اڑ گیا رخ سی رنگ ہو کر

جو راز دل سے زباں تک آیا تو اس کو قابو میں پھر نہ پایا
زباں سی نکلا کلام بنکر گماں سی چھوٹا خدنگ ہو کر

غضب ہی بحرِ فنا کا دہارا کہ مجھکو الجھا کے مارا مارا
نفس نی موجوں کا جال بنکر لحد نے کام نہنگ ہو کر

ملا دلِ ناحفاظ مجھکو تو کیا کسی کا لحاظ مجھکو
کہیں گریباں نہ پھاڑ ڈالیں جناب ناصح بھی تنگ ہو کر

جواب کی مینا ئے مے کو توڑا چلی گی تلوار محتسب سے
لہو بھی رندوں کا دیکھ لینا بہا مئی لالہ رنگ ہو کر

نہ ضبط سی شکوہ لب تک آیا نہ صبر آہ کھینچنی دی
رہا دہن میں وہ قفل بنکر گرا یہ چھاتی پہ سنگ ہو کر

سمجھ لے صوفی اگر یہ نکتہ ہی ایک نغمہ سماع ہستی
تو نو سیاالی یہ آسماں کے بجیں ابھی جلترنگ ہو کر

بھلا ہوا فسردہ خاطری کا کہ حسرتوں کو دبا کے رکھا
بچا لیا ہرزگی سی اس نے لحاظ ناموس و ننگ ہو کر

جگر خراشی سے پائی فرصت نہ سینہ کاوی سی ناخنوں نے
گلا گریباں نے گھونٹ ڈالا جنوں کی شورش سے تنگ ہو کر

بدل کے دنیا نے بھیس صدہا اسی ڈرایا اوسی لبھایا

کبھی زن پیرِ زال بن کر کبھی بہت شوخ و شنگ ہو کر
اُٹھے تھے تلوار کھینچ کر تم تو پھر تامل نہ چاہیے تھا
کہ رہ گئی میرے دل کی حسرت شہیدِ تیغِ درنگ ہو کر
جو ولولے تھے وہ دب گئے سب ہجومِ ابیت قتل میں حیدرؔ
جو حوصلے تھے وہ دل ہی دل میں رہے ہوئے وفا ہو کر

١٣ مفاعیلن ۴ بار ٨٧

جنوں کے ولولے جب گھٹ گئے دل میں نہاں ہو کر
تو اُٹھے ہیں دھواں ہو کر گرے ہیں بجلیاں ہو کر
کچھ آگے بڑھ چلے سامانِ راحت لامکاں ہو کر
فلک پیچھے رہا جاتا ہے گردِ کارواں ہو کر
کسی دن تو چلے اے آسماں بادِ مراد ایسی
کہ اتریں کشتیِ مے پر گھٹائیں بادباں ہو کر
نہ جانے کس بیاباں مر گئے مٹی نہیں پائی
بگولے جا رہے ہیں کاروان در کارواں ہو کر
وفورِ ضبط سے بیتابیِ دل بڑھ نہیں سکتی
گلے تک آ کے رہ جاتے ہیں نالے ہچکیاں ہو کر
نگوں گیر اب تو ایسا انقلابِ رنگِ عالم ہے

کہ نغمے نکلے منقارِ عنادل سے فغاں ہو کر

جو ہو کر ابر سے مایوس[1] خود سینچے کبھی دہقاں
جلادیں کھیت کو پانی کی لہریں بجلیاں ہو کر

جہاں میں واشدِ خاطر کے ساماں ہو گئے لاشئے
جگہ راحت کی ناممکن ہوئی ہے لامکاں ہو کر

ہنسے کوئی نہ بجلی کے سوا اس دارِ ماتم میں
اگر رہ جائے سارا کھیت کشتِ زعفراں ہو کر

الم میں آشیاں کے اس قدر تنکے چنے میں نے
کہ آخر باعثِ تسکیں ہوئے ہیں آشیاں ہو کر

گھٹائیں گھر کے کیا کیا حسرتِ فرہاد پر روئیں
چمن تک آگئیں نہریں پہاڑوں سے رواں ہو کر

دلِ شیدا نے پایا عشق میں معراج کا رتبہ
یہاں اکثر بتوں کے ظلم ٹوٹے آسماں ہو کر

جو ڈرتے ڈرتے دل سے ایک حرفِ شوق نکلا تھا

لہ مایوس فارسی والوں کا تراشا ہوا لفظ ہے اور لغات فرس میں غلط العام ہی نہیں صحیح ہے اور اب اردو میں بھی مستقل ہو گیا ہے۔ اسے فارسی میں نہیں استعمال کرنا چاہیے منوس بھی ملیوس کے قیاس پر فارسی والوں کا تراشا ہوا ہے ۱۲

وہ اس کے سامنے آیا زباں پر داستاں ہو کر

نکل آتے ہیں ہر اقرار میں انکار کے پہلو
بنا دیتی ہیں حیراں تیری باتیں مکریاں ہو کر

نزاکت کا یہ عالم پھول بھی توڑے تو بل کھا کر
نہ جانے دل میرا کس طرح توڑا پہلواں ہو کر

تذرو و کبک پر ہنس کر اوٹھی خود لڑکھڑاتے ہیں
سبک کرتے ہیں اُن کو یانچے بارِ گراں ہو کر

گلا گھونٹا ہی ضبطِ غم نے کچھ ایسا کہ مشکل ہے
کہ نکلے منہ سے آوازِ شکستِ دل فغاں ہو کر

نتیجہ اندیشۂ سالک نے پایا منزلِ دل کا
تو پلٹا لامکاں سے آسماں در آسماں ہو کر

ہوئی پھر دیکھیئے آبستنِ شادی و غم دنیا
ابھی پیدا ہوئے تھے رنج و راحت تواماں ہو کر

جو نکلی ہو گی کوئی آرزو تو یہ بھی نکلے گا
تمہارا تیرِ حسرت بن گیا دل میں نہاں ہو کر

اوتر جائیگا تو او آفتابِ حسن کوٹھے سے
گریگا سایۂ دیوار ہم پر آسماں ہو کر

۷ ۸

ولہ

وہی سمجھیں گے اس کو جو نظر رکھتے ہیں جوہر پر
کہ اب تک منس رہا ہے آئینہ بختِ سکندر پر

خبر دیتا ہے بیتابی کی اشکِ خوں سر مژگاں
لہو کی بوند دیکھو اور کروٹ نوک نشتر پر

مئے عرفاں کہ چھوٹی کی ہوئی ہے میرے ساقی کی
ٹپکتی ہے مری رال اس شرابِ روح پرور پر

بنائی جان ایسی سخت اور دل اسقدر نازک
زہی قدرت تری پھینکا ہے کیا شیشہ کو پتھر پر

بڑھایا کیا سمجھ کر اور اس پر بارِ عصیاں بھی
ازل کے دن سے کچھ بارِ امانت کم نہ تھا سر پر

کہیں ایسا نہ ہو نالوں سے میرے حشر ہو جائے
مرا انصاف یارب تو نے کیوں رکھا ہے محشر پر

لہو اشک آنکھوں میں بھر لائے ہو آئینہ دکھادو نہیں
ڈھلکنا دیکھ لو شبنم کا رخسارِ گلِ تر پر

۸ فاعلاتن مفاعلن فعلات ۸۹

آفریں شوق گام فرسا پر	گر کے اٹھا ہوں میں ہر اک جا پر

باندھی ہے مدح شہ کی دھن میں نے
نغمۂ عندلیب شیدا پر

دے خدا اگر دل و زباں تو کرے
شکر راحت پہ صبر ایذا پر

جزر و مد میں فنا کے ہے عالم
بہ رہا ہے یہ قصہ دریا پر

ق

آسماں پھینکتا ہے سنگِ جفا
تاک کر قلب ناشکیبا پر

رقص اس گنبدِ زبرجد کا
ہے صدائے شکستِ مینا پر

کچھ سلیمان سے بھی زیادہ ہے
نازِ منعم کو نقش دیبا پر

خطبہ پڑھتا ہے پیرزن کا غبار
عدل کسریٰ کا طاقِ کسریٰ پر

حرف ش

٩٠ ١٤

خار حسرت کو ہے جگر کی تلاش
گلِ داغِ جنوں کو سر کی تلاش

عشق میں تیرے ہے جہاں بیمار
چارہ گر کو ہے چارہ گر کی تلاش

اپنے دل میں خدا کو ڈھونڈھ لیا
حد سے اب بڑھ گئی بشر کی تلاش

میں دعا مانگتا ہوں محشر کی
ہے جو اک شوخ فتنہ گر کی تلاش

میکدہ کو ہمارے ڈھونڈھ لیا
گئی خالی نہ ابر تر کی تلاش

سرمہ خوش چشم کو ہے مد نظر
فتنہ گر کو ہے فتنہ گر کی تلاش

جو رہ عشق میں ہیں وارفتہ
نہیں رکھتے وہ راہبر کی تلاش

ایڑیوں تک پہنچ کے ٹھہری زلف
مصرع قد ہے رات بھر کی تلاش

دو پہر تک تھا انتظار اوس کا
دو پہر تک رہی سحر کی تلاش

مجھ کو سکتا ہوا جو ہجر کی شب
رہی آئینہ سحر کی تلاش

غرق رہتا ہوں فکر مضموں میں
ڈوب کر چاہیے گہر کی تلاش

یا الٰہی ہوا ایسا جوش بہار
رگ گل کو ہو نیشتر کی تلاش

دل جو ٹوٹا تو پھر نہیں جڑتا
کیجیے خاک شیشہ گر کی تلاش

مل گئی قبر کی جگہ اے نظمؔ
ہوگئی ختم عمر بھر کی تلاش

۹۱ ــــ مدح اعلیٰ حضرت قدر قدرت خلد اللہ ملکہٗ ــــ ۱۰

شب قدرست زلف عنبرینش
طلوع صبح عید است از جبینش

شہ با ذل کہ حق یادش نگہبان
بہ تاج و تخت و ملک و داد و دینش

چناں آراست ملکش در زمانش
کہ مثل آسماں شد سر زمینش

معظم جاہ شد ماہ تمامش
چو اعظم جاہ شد مہر مبینش

رواں کردست دریا در بیاباں
کہ باشد بحر عماں در کمینش

فلک نیلی ز عکس آبگونش
زمیں سرسبز از ماء معینش

زہے ایں چشمہ سار صاف شیریں
عیاں راز دل از چین جبینش

چناں کشت و چمن را کرد شاداب
کہ عذرا بر فلک شد خوشہ چینش

کنارِ رود موسی داور ریگاہ
زہے شاہیکہ در قالب شد روح ۹۲

کہ موسی خاتم است و او نگینش
صریر کلک معنی آفرینش ۱۳

ولہ

طلسمے ہیش بنود لجہ ہستی و سیلابش
کہ بر ہم میزند موج فنا صد نقش بر آبش
زند صد قافلہ پے ہم کند صد سلسلہ برہم
گہ از ابروئے پُرچینش گہ از گیسوی پُرتابش
دوائے دردِ دل باشد لب آں عیسی دوراں
کہ دارد طعم صد تنگ شکر اندر دو عنابش
چو اکسیر وفا خواہی شرار عشق روشن کن
دل مضطر بدست آور کہ بیتابیست سیمابش
رگِ نخوت ہمی باشد طناب گردن ظالم
کہ بر خاک مذلت میکشد از فرش کمخابش
بہ زخمِ ابروے اولذت آزاردہ چنداست
کہ بوئے مشک می آید ازیں تیغ سیہ تابش
اگر سر می نہم بر پائے نازک سر گراں گردد
دگر سر می کنم افسانہ غم می برد خوابش

سپہر و انقلاب پے ہم او نیست بے چیزے
کہ خون عالمے چوں آب خواہد ریخت دولاشش

بگورستاں سرِ فغفور می بینم سرِ خشتے
کجا شد بالشِ قاقم کہ بد نازش گہ خوابش

اگر برخاست روزے گردباد از آہِ مظلوماں
شکست او تادِ ایں نہ خرگہِ نیلی و اسبابش

ہوریں جوشِ سرشک از ماجرائے دل چہ می پرسی
کہ سر بر زد حباب آسا ز بحر و بر و سیلابش

عزیزے کو کہ از اسرارِ ہستی پردہ بر گیرد
دلِ خلقے بجاں آمد ز یک تعبیر و صد خوابش

نباشد صورتے فارغ ز معنی اندریں عالم
چو آئینہ قدم زن در رہِ دیدار حیدر یابش

حرف ض

۹۳ — ۱۰

کچھ ابر نے اوڑتی ہوئی دی ہے خبرِ فیض
کانٹوں پہ ہے دوڑا ہوا آنکھوں پہ ہے رشتہ
آتا نہیں دریا کی روانی میں کبھی فرق

ساقیِ نظرِ فیض ہو ساقیِ نظرِ فیض
اک وادیِ اسرار ہے اک رہ گذرِ فیض
تھمتے نہیں تھمتی نہیں شوریدہ سرِ فیض

کہتے ہیں جسے چشمِ طلب وہ تو ہو پیدا
اک جنبشِ مژگاں سے کہیں لاکھ درِ فیض

طوبیٰ لکم اے اہلِ کرم واہ ری رفعت
لے اڑتے ہیں طوبیٰ کیطرف تا بال و پرِ فیض

اے سر مغاں دست نگر تیرے ہیں میکش
ہاتوں کی لکیریں ہیں کہ ہیں رہ گذرِ فیض

کیا اہلِ قناعت کو غرض اہلِ غنی سے
ہم کو سر فیض اب نہ رہا، نہیں در و سر فیض

زاہد تجھے کیا اس کی کریمی سے عجب ہے
توبہ کا ہو در بند تو کھل جائے درِ فیض

گرداب حوادث میں ہوں اے مصدرِ فیاض
اُتر جاؤں میں ہو جائے جو تجھ پر نظرِ فیض

مانندِ نگیں آنکھ جھپک جائیگی اے نظم
اُٹھ جائیں گے ہم چھوڑ کے اپنا اثرِ فیض

۹۴ ——— حرف (ف) ——— ۱۶

پھری ہوئی مری آنکھیں ہیں تیغ یار کیطرف
چلا ہے چھوڑ کے بسمل مجھے ہرن کیطرف

بنایا تو نے آئینہ آئینہ خانہ[۱]
نہ دیکھی راہ جو چلو تو سے انجمن کیطرف

رہِ وفا کو نہ چھوڑا وہ عندلیب ہوں میں
چھٹا قفس سے تو پرواز کی چمن کیطرف

گریز چاہیے طولِ اہل سے سالک کو
سنا ہے راہ یہ جاتی ہے راہزن کیطرف

سرا اُدھر ہیں سوؤ گے غافلو کب تک
اٹھو تو کیا تمہیں جانا نہیں وطن کیطرف

بیمار دل میں الگ ہیں وہ اہلِ ظاہر سے
نہ ہیں ہوس شیخ کی جانب نہ برہمن کیطرف

[۱] آئینہ کے ہر ٹکڑے میں پورا عکس دکھائی دیتا ہے سو ہر ٹکڑا آئینہ بن جاتا ہے ۱۲

جہانِ حادثہ آگیں میں شکوہ و رود
گذر حباب کا دریائے موجزن کی طرف

اسی امید پہ ہم دن خزاں کے کاٹتے ہیں
کبھی تو بادِ بہار آئیگی چمن کی طرف

بچھڑ کے تجھ سے مجھے ہے امید ملنے کی
سنا ہے روح کو آنا ہے پھر بدن کی طرف

گواہ کون ہے قتل کا ہو محشر میں
ابھی سے سارا زمانہ ہے تیغ زن کی طرف

خبر دی اٹھ کے قیامت نے اسکے آنے کی
خدا ہی خیر کرے رخ ہے انجمن کی طرف

وہ اپنے رخ کی صباحت کو آپ دیکھتے ہیں
جھکے ہوئے گل نرگس ہیں یاسمن کی طرف

تمام بزم ہے کیا محو اوس کی باتوں میں
نظر دہن کی طرف کان ہے سخن کی طرف

اسیر ہو گیا دل گیسوؤں میں خوب ہوا
چلا تھا ڈوب کے مرنے چہ ذقن کی طرف

یہ مسکنیوں کی ادا اثر بھی سیکھ گئے
کنارِ جو سے جو لوٹے چلے چمن کی طرف

زہے نصیب جو ہو کربلا کی موت اے نظمؔ
کہ اوڑ کے خاکِ شفا آئے خود کفن کی طرف

۹۵

(۸)

ہوں میں سیدھا گیا وحشت میں بیاباں کی طرف
ہاتھ جس طرح سے آتا ہے گریباں کی طرف

تھمے بیٹھے دل غمگیں کو یہ کیا لہر آئی
اوٹھ کے طوفان چلا دیدۂ گریاں کی طرف

دیکھنا لالۂ خود رو کا لہکنا ساقی
کوہ سے دوڑ گئی آگ بیاباں کی طرف

رو دیا دیکھ کے اکثر میں بہارِ شبنم
ہنس دیا دیکھ کے اکثر گلِ خنداں کی طرف

بات چھپتی نہیں پڑتی ہیں نگاہیں سب کی
اوس کے دامن کی طرف میرے گریباں کی طرف

سیکھ وہ داغ گنہ جھو گئے رحمت تیری
کیا گھٹا جھوم کے آئی تھی گلستاں کی طرف

چشمِ آئینہ پریشاں نظری سیکھ گئی
دیکھتا تھا یہ سبب زلف پریشاں کی طرف

سر جھکائے ہوئے ہے نظم پسان خامہ
سمت سجدہ کی ہے تیری خطِ فرماں کی طرف

۹۶ حرف ق ۱۲

خاک جاں بر ہو مبتلائے فراق
لے چلی قبر میں بلائے فراق

ہے فلاطونِ عشق کا ارشاد
شربتِ مرگ ہے دوائے فراق

نہ بنا نا ہو طرزِ نازشِ وصل
منہ پھراتا ہے اک ادائے فراق

شبِ فرقت ابھی سحر ہو گی
لب تک آئیں تو نالہائے فراق

تھے مزے عشق کے جوانی تک
ہائے لطفِ وصال ہائے فراق

وصل کی تو دعا قبول نہیں
مانگنا چاہیے دعائے فراق

ہو گئی صبح رہ گیا قصہ
تھے ابھی لب پہ شکوہ ہائے فراق

تا فلک پہنچی نا اثر نہ گئی
واہ ری آہِ نارسائے فراق

چشم پر خوں کا جام پر ہے یقیں
گریہ سمجھا ہیں خندہ ہائے فراق

گشتہ سیماب اضطراب کا ہے
دل کو حاصل ہے کیمیائے فراق

ساغرِ بادہ ہے دل پر خوں
شورِ فرہاد ہے صلائے فراق

جی بچا گر تو وصل یار ہے پھر
جمیل نے نظم سب جفائے فراق

حرف م

۹۷ —— ۱۷

نہ پا سکے گل مقصود اس بہار سے ہم
اٹھا کے داغ چلے باغ روزگار سے ہم

ادھر تھی بادیہ کے تجلی خورشید
جھلک نہ دیکھ سکے پردہ غبار سے ہم

اثر سے رونے کے ہے وہ ہمارے حسن اسیر
شکار کھیلتے ہیں دام آبشار سے ہم

فنا ہوں یوں کہ ملی بعد اس کے عمر ابد
نکالیں آب بقا ظلمت مزار سے ہم

رہیں گے صورت عیسیٰ نہ راہ ہستی میں
پیادہ ہو کے نکل جائینگے سوار سے ہم

کمند بام حقیقت تھا عشق قامت یار
فلک پہ چڑھ گئے عیسیٰ کی طرح دار سے ہم

خدا کے واسطے جابر اسے کہے نہ کوئی
اٹھا رہے ہیں یہ جبر اپنے اختیار سے ہم

نشان کسی کو ہو معلوم عمر رفتہ کا
صدا یہ سنتے ہیں ہر قبر کے غبار سے ہم

مٹی نہ کاہش جاں رنج میں نہ راحت میں
خزاں سے غم مجھے حاصل ہوا بہار سے ہم

ہوئی کدورت دل دور خاکساری سے
دیں آئینہ میں جلا رکھتی ہیں غبار سے ہم

وہ آئی میں مگر ایسی ہمیں ہے بیخبری
کہ دیکھتے ہیں انہیں چشم انتظار سے ہم

نہ خواب میں کبھی آئی تھیں ہجر کی راتیں
گئے وہ دن کہ نہ واقف تھے چاہ و پیار سے ہم

قطعہ

عدم سے دہر میں برزخ سے آئے محشر میں — رکا نہ پاؤں نہ بیٹھے کہیں قرار سے ہم
خبر یہ شور میں تھی ہو کریم کا دربار — یہ شور سن کے نکل آئے ہیں مزار سے ہم

قطعہ

نہ سمجھے یہ کہ نمائش سراب کی ہے جہاں — غضب میں پڑ گئے ہستی کے اعتبار سے ہم
غضب کا رقصِ فلک نے ہمیں دیا دھوکا — رہے نہ آپ میں اک جلوہ شرار سے ہم

ہزار معرکہ امتحان ہوئے اے نظم
کسی سے کم نہ رہے فضلِ کردگار سے ہم

۹۰ — ۱۴

جاں در ہوائے بادہ اطہر فروختیم — دل در بہائے ساغر کوثر فروختیم
در کار سالمان زر و زیور فروختیم — وز بہر حفظ نام و نسب سر فروختیم
تا دل بہ آں دو زلفِ معنبر فروختیم — خود را فروختیم و مکرر فروختیم
جاں را برائے آبروئے خود فشاندہ ایم — سر را پئے گرفتن افسر فروختیم
درماندہ ایم زیر فلک چوں ہلال و بدر — تا تیغ آوریم بکف سر فروختیم
تا جا گرفت در دل ما خوف بازپرس — از رنگ روئے خود ورق زر فروختیم
ترکِ خودی جز اشکِ ندامت بہانہ داشت — آئینہ خانہ را بدو گوہر فروختیم
در شعر ایں بخوں جگر با فشردہ ایم — تا مشک نافہ فصلِ بہار گل تر فروختیم
رفتی غبار طبع بہ شیریں تبسمی — شادیم تا کہ خاک بہ شکر فروختیم

افتاد تا معامله با رحمت خدا | ما نامه سیاه به محشر فروختیم
رود او خافه مستی ما میکشان مپرس | دستار را به شیشه و ساغر فروختیم
وارفتگی ما بخرام کسی مپرس | خود را بدست فتنه محشر فروختیم

ولہ

۹۹ —— مفتعلن فاعلات ـ مفتعلن فا —— ۱۱

همتی از باد صبحگاه گرفتم | رفتم و از غنچه درس آه گرفتم
عزم شبی خون ترا مبارک و فرخ | فال ز بشکستن کلاه گرفتم
دل بغم تو نداشت تاب صبوری | اشک سر اسیمه را گواه گرفتم
منفعلم از وفا بعرصه محشر | دامن یوسف باشتباه گرفتم
مستی من از شراب گردش چشمیست | باده به پیمانه نگاه گرفتم
خار غم از بسکه داشت تشنه لبیها | شغل دل از نبض برق آه گرفتم
باطن من شد ز شرم ظاهر من آب | نکته چو بر آب زیر کاه گرفتم
از قدمم گردباد تارگ ابراست | من ز بیابان سراغ چاه گرفتم
خاک بچشم فشاند و قافله بگذشت | سرمه عبرت ز گرد راه گرفتم
نقش ستمگار را بکشم و آنگه | دست و گریبان عذرخواه گرفتم

شعر اسیر است نظم شمع ره ما
آتش از آن گرمی نگاه گرفتم

حرف ن

۱۰۰ —— مفاعلن فعلاتن مفاعلن فعلات —— ۴۰

غرض بیاں میں نہیں اب اثر فغاں میں نہیں
بہار میں جو طبیعت تھی وہ خزاں میں نہیں

جو چلبلے تھے نہیں انکا پتہ جہاں میں نہیں
نشان نقش قدم جا کے رفتگاں میں نہیں

خوشی خوشی شب عشرت کسی میں کٹتا ہوں
کہ ایسی رات کوئی عمر جاودانمیں نہیں

یہ دیکھنا گل و بلبل کی کچھ بن آئی ہے
اب اتفاق جو صیاد و باغباں میں نہیں

مجھی پہ حوصلے نکلیں گے آج قاتل کے
مری سوا کوئی میدان امتحاں میں نہیں

چلی نہ چشم فسوں گر سے کچھ فسوں سازی
وہ سحر کونسا ہے جو مری بیاں میں نہیں

وہ سو کے اٹھے ہیں کسکو مجال عرض نیاز
غزل جو پوچھیے یہ جرأت غزل خواں میں نہیں

بھبھولا داغ ہے میرے دلمیں اے ناصح
مجھے عجب ہے کہ چھالا تری زباں میں نہیں

وہاں خمار تغافل سے سرگرانی ہے
یہاں شراب اثر شیشۂ فغاں میں نہیں

دیا مجھے تری نرگسوں نے اے غم عشق
وہ داغ جو پر طاؤس آسماں میں نہیں

مرا لہو شب غم نے پیا تو چین آیا
کہ آج صورت خمیازہ کہکشاں میں نہیں

کشش جو دل میں ہے میری شرر جو آہ میں ہے
وہ کہربا میں نہیں ہے یہ کہکشاں میں نہیں

فلک کو رشک ہے اس کو طرز دامن پہ
ستارے ایسے یہ تحریر کہکشاں میں نہیں

جگر میں عشق کا ہے داغ رخ پہ اسکی چمک
فروغ ماہ نہاں ہے وہ کتاں میں نہیں

وہ کاش سائل دیدار کو جلا دیتا
کوئی شرار ترے سنگ آستاں میں نہیں

ہر ایک قافلہ ریگ رواں و غم رواں
متاع درد محبت جو کارواں میں نہیں

رہیگی کشتی تن غرق ہو کے خشکی میں
جو خاک لا میں کشش ہے وہ بادباں میں نہیں

بزور ہمت مردانہ توڑ ہفت حصار
کہ راہ بند ہے رستم جو ہفت خواں میں نہیں

جو طبع رمز شناس و کنایہ فہم ہو
تو کچھ مزہ گل و بلبل کی داستاں میں نہیں

برا نہ مان جو پہنچے کسی سے رنج ای نظم
کہ ہوشیار کوئی دور آسماں میں نہیں

۱۵ ——— ۱۰۱

حریف تم نہ سہی دوستدار بھی تو نہیں
وہ آنکھ اب نہیں وہ چاہ و پیار بھی تو نہیں

مرا لہو ہے زاہد جو پی نہ لے یہ جام
کہ دن ہے عید کا تو روزہ دار بھی تو نہیں

چمک گئی ہے کچھ ایسی کہ ابر و برق ہے مات
ہوا کے گھوڑے پہ ظالم سوار بھی تو نہیں

نہیں ہیں ہستی ناپائیدار کا قائل
کہ مستعار کہوں مستعار بھی تو نہیں

اٹھاؤں ظلم میں کس کس کا نو فلک میں و عدو
کہ دل تو ایک ہے دو تین چار بھی تو نہیں

ہے ایک تار مرے جسم زار کو کافی
مگر کفن کے لئے ایک تار بھی تو نہیں

لحد کا پائیں گے کس طرح سے پتہ احباب
جنوں میں ایک جگہ پر قرار بھی تو نہیں

دل و جگر ہوئے تیغ نگاہ سے چو رنگ
پھر اس پہ لطف یہ ہے آنکھ چار بھی تو نہیں

نہ دل لگا کے کبھی درد دل سنا میرا
ہزار بار کہا ایک بار بھی تو نہیں

یہ ہاتھ دوڑ رہا ہے عبث گریباں پر
کہ تار تار یہ ہے کچھ ستار بھی تو نہیں

اگر یہ حشر میں مجھ سے حساب کیا ہوگا
کہ بے حساب گنہ میں شمار بھی تو نہیں

کہا کہ درد جگر پھر کہو میں کہتا ہوں
ستم یہ ہے کہ تمہیں اعتبار بھی تو نہیں

کسی گڑھے میں گرا دے نہ تجھکو توسنِ عمر
وہ تیز گام ہے تو شہسوار بھی تو نہیں

اوڑانے آئے تھے ہم خاک کوئے قاتل میں
بدن پہ سر نہیں سر پر غبار بھی تو نہیں

یہ سچ ہے نظم ہے دیوانگی میں رسوائی
جہاں میں ایسا کوئی پردہ دار بھی تو نہیں

۲۵ —— ۱۰۲

تو ایک آہ میں اے چرخ کج مدار نہیں
جو خاک میں نہ ملا دوں تو خاکسار نہیں

کسی سے بسکہ امید کشود کار نہیں
مجھے اجل کے بھی آنیکا اعتبار نہیں

جھکوں جو اہل تکبر سے خاکسار نہیں
فلک سے دبکے رہی جو وہ یہ غبار نہیں

فقیر خانہ میں اہل ہوس کو بار نہیں
کہ شمع بھی مری محفل میں تاجدار نہیں

پھر اور کیا ہے یہ عالم جو رہگزار نہیں
کہ ہستی گذراں کا کچھ اعتبار نہیں

ہستی کے گذران ہونے سے معلوم ہوا ہے کہ عالم رہگذار ہے

یہ آن بان طبیعت میں ہو تو انساں کیا
کہ جسمیں بل نہ ہو یہی وہ استوار نہیں

سنبھالے کون کسی کو لے کسی کی خبر
تمام بزم میں کوئی بھی ہوشیار نہیں

یہ مجھ سے تربت کا نقشہ نظر کرتا ہے
مزاج یار ہوں کچھ میرا اعتبار نہیں

کسی کے خون کا پیاسا ضرور ہے صیاد
کماں میں تیر ہے قمر اک میں شکار نہیں

جواب نامہ کا قاصد ہزار پہ... لایا
کہ جانتا تھا اسے تاب انتظار نہیں

یہ کہہ کے اٹھ گئی بالیں سے میری شمع سحر
تمام ہو گئی شب اور تجھے قرار نہیں

زمیں سخت فلک دور ہے بشر مجبور
مزہ ہے جان بھی دینے پہ اختیار نہیں

قریب تر رگ گردن سے پھر بھی آشنا دور
نظر کے سامنے وہ پھر بھی آشکار نہیں

کسی کے جلوہ کو اس مشت خس سے کیا نسبت
وہ صاعقہ ہے نہیں شعلہ نہیں شرار نہیں

جو وہ ہو پاس تو حور و قصور سب کچھ ہو
جو وہ نہیں تو نہیں بلکہ یہ بہار نہیں

چلے جو خاک شہیداں پہ اس گلی کی ہوا
چراغ لیکے بھی ڈھونڈو تو پھر مزار نہیں

کھڑے ہیں دام بچھائے ادھر ادھر صیاد
نہ کھا فریب یہاں نخل سایہ دار نہیں

گذرتے ہیں نفس مستعار مثل نسیم
کسی کو خار نہیں میں کسی پہ بار نہیں

عدم کا قافلہ کیا جانے کس طرف کو گیا
ذرہ بھی گرد نہیں راہ میں غبار نہیں

اوسی سے کہہ تیری کہنی یہ جو چلے ناصح
میں ہرزہ گرد نہیں ہوں نہیں ہرزہ کار نہیں

خزاں کے آنے سے پہلے ہی تھا مجھے معلوم
کہ رنگ و بوئے چمن کا کچھ اعتبار نہیں

فلک ہے وہ شتر کینہ ور خدا کی پناہ
عقال پاؤں میں جسکے نہیں مہار نہیں

ملیگی چشمہ حیواں کی تہ میں غلطم سم
کوئی زمیں نہیں ایسی جہاں مزار نہیں

مقرر ہے دل میں تو دشمن زباں سے گو ہو ہی
جو چوٹ کھا کے نکل جائے کیا شکار نہیں

غزل کہی ہے کہ موتی پروئے ہیں اے نظم
وہ کون شعر ہے جو در شاہوار نہیں

١٠٣ — ١٤

نہ اہل دل سے نہ اہل نظر سے پوچھتا ہوں
خبر وہاں کی ہر اک بے خبر سے پوچھتا ہوں

وفور شوق میں کھویا گیا ہوں نہیں ایسا
کہ نامہ لکھ کے پتہ نامہ بر سے پوچھتا ہوں

بتا یہ خواب کا عالم ہے یا ہے بیداری
یہ اپنی چشم حقیقت نگر سے پوچھتا ہوں

کوئی خبر نہیں دیتا ہے خاک جسم کی بھی
میں خشت گر سے کبھی کوزہ گر سے پوچھتا ہوں

میں وہ ہوں گرد پس کارواں قد آدم
کہ رہروؤں کا نشاں رہ گذر سے پوچھتا ہوں

اسی طرح مری آغوش سے اٹھا تھا کوئی
تڑپ تڑپ کے یہ درد جگر سے پوچھتا ہوں

عبث ہے خضر اگر ساتھ ہو لیے میرے
کہیں میں اس کا پتہ راہ بر سے پوچھتا ہوں

کرشمہ اس کی نگہ کے کسی سے کیوں پوچھوں
یہ اپنے دل سے یہ اپنی جگر سے پوچھتا ہوں

ملا نہ نقش قدم سے تو رہروؤں کا پتہ
میں اب غبار سر رہ گذر سے پوچھتا ہوں

بھرا ہے جام صبوحی کا شاخ گل کی طرح
پتہ چمن کا نسیم سحر سے پوچھتا ہوں

شجر ہیں وجد میں کیوں گل ہیں کس لئے بیخود
یہ حال بلبل شوریدہ سر سے پوچھتا ہوں

ہنوز سر حقیقت کا ذوق باقی ہے
جواب کچھ نہ ملا عمر بھر سے پوچھتا ہوں

جگر تھا میرا ہی کیا اور کب ستم کے لئے
یہ آج قاتل بیداد گر سے پوچھتا ہوں

بتا تو عشق کا انجام ہوگا کیا اے نظم
مآل کار کو میں نیشتر سے پوچھتا ہوں

١٠٤ — ١٨

جو دل کو پیس کے پھینکیں تو آرزو نہ کریں
جو پاؤں کاٹ کے بیٹھیں تو جستجو نہ کریں

وہ جا کے باغ میں غنچہ کا دل لہو نہ کریں
شہید سرو چمن کو کنار جو نہ کریں

نکالیں تیغ کہ یک سو ہو روز کا جھگڑا
رقیب مجھ سے لگی لپٹی گفتگو نہ کریں

وہ اشک کیسے پھپھولے نہ جن سے پڑ جائیں
وہ داغ کیسے کلیجہ کو جو لہو نہ کریں

کہیں ہزار میں حق ہم وہ تیغ عریاں ہیں
کسی کا منہ نہ کریں پاس آبرو نہ کریں

جناب شیخ کے زہد و ورع کو دیکھ لیا
کٹیں یہ ہاتھ جو اب بیعت سبو نہ کریں

گلہ نہ شکوہ کہ وہ لب سی لب ملائے ہیں
دہن یہ مہر یہ کی ہے کہ گفتگو نہ کریں

قسم یہ دیکھے میں کہتا ہوں آرزوؤں سے
مرا لہو پیئیں دل اگر لہو نہ کریں

حریف نکلے نہ چھریاں لگائیں بس مجھکو
شراب حلق سے اتری ہوئی لہو نہ کریں

وہی ہے سامنے مڑ کر جدھر جدھر دیکھو
وفور شوق میں کیوں سجدہ چار سو نہ کریں

مرا غبار یہ اٹھ اٹھ کے کہتا ہی سر راہ
کہ پاؤں چلتے ہوں ور تیری جستجو نہ کریں

گناہ گار کو آتی ہے منہ دکھلاتے شرم
ہماری لاش کو احباب قبلہ رو نہ کریں

وہ پاک عاشق شوریدہ سر ہوئے کہ کبھی
حسین جہانکے مراد کرے بے وضو نہ کریں

جو دل یہ رکھیں تو رکھیں نہ دلمیں کوئی ہوس
جو دل کریں تو کسی شئے کی آرزو نہ کریں

جہاں کو رہ گذر عاریت اگر سمجھیں
مقام پھر کوئی دم مثل آب جو نہ کریں

ملا ہی یہ گل صد برگ سی سبق ہم کو
ہزار بھی ہوں زبانیں تو گفتگو نہ کریں

نماز میں نہ ہمیں قتل نفس ہو منظور
تو آستیں الٹ کر کبھی وضو نہ کریں

نکل گیا کسی صحرا میں نظم آخرکار
جو یوں گیا اسے جانے دیں جستجو نہ کریں

۱۰۵ ـــــ مفاعیل فاعلات مفاعیل فاعلات ـــــ ۲۰

چھلکی ہے چاندنی سی دل پاکباز میں
ہے داغ سجدہ چاند جبین نیاز میں

آتی تھی بوئے ناز جو عرض نیاز میں
خاموش مثل شمع ہوں سوز و گداز میں

کچھ تجھ کو یہ خیال بھی ہے مشق ناز میں
پامال ہو گیا کوئی اس ترک تاز میں

جو شوخیاں ہیں خامہ افسوں طراز میں
وہ خوبیاں نہیں ہیں بتان طراز میں

ڈھیلے پڑے ہیں بند قبا خواب ناز میں
نقد وصال ہے گرہ نیم باز میں

نیچی نظر ہے شرم کی اونچی ہے قہر کی
بچتا نہیں شکار نشیب و فراز میں

دل لیکے بھول جانیکی عادت ہے آپ کو
اب کے گرہ لگائیے زلف دراز میں

دل میرا اس طرف ہے ادھر دل رقیب کا
دونوں کو تولئے نظر امتیاز میں

بے پردہ ہو گیا ہے تجلی سے حسن یار
ہے طاقت نگاہ کسی دیدہ باز میں

تیری زباں سے آگ لگی شمع انجمن
میری زباں کو دخل نہیں میرے راز میں

تقدیر کے لکھے کو نہ ہرگز برا سمجھ
لغزش محال ہے قلم کارساز میں

پردہ میں نغمہ زن ہے تو دھوکا ہی ہو گیا
ہے جسم میں یہ روح کہ آہنگ ساز میں

کہتی تھی آج شمع سحر مجھ کو دیکھ کر
جیتے ہو کس طرح سے غم جانگداز میں

پھانسی لگا رہی ہے اجل کیا بری طرح
الجھا کے رشتہ ہائے امید دراز میں

ہوں میں تو ناتواں مجھے کیونکر نہ خوف ہو
خالی نہیں فریب سے عیشِ امن جہاں کل
اس بحرِ پُر خطر میں مع نمیں جس کی موج
وہ صید پُر شکستہ ہوں باقی ہے پر نہ تن
تسبیح اوسنے بعد پڑھی بھی تو کیا حصول
تھا طاعتِ خدا میں بھی یہ حال نظم کا

پھنستے ہیں شیر دام گہ حرص و آز میں
ساغر شراب کا ہے کفِ شیشہ باز میں
ڈر کر ہوا سوار تلاطم جہاز میں
میں نے ہوائے بال و پر و شاہباز میں
سو مرتبہ خدا کو جو بھولا نماز میں
تصویر ایک کی رہی جا نماز میں

١٠٦

مبرم قضا سے عشوہ سحر آفریں نہیں
وہ دن ہے کونسا کہ میں اندوہ گیں نہیں
رکھتے کہیں ہو پاؤں تو پڑتا کہیں ہے پا
جنبر کیطرح رنگ بدلتا ہے آسماں
او تنگ دل یہ ہاتھ خزانہ کا سانپ ہے
سر میں بھرا ہوا ہے تیری بادہ غرور
سرمہ سی کر دیا ہے سخن گو غزال کو
پینے میں خونِ دل کے حلاوت کہاں ہے
جنت میں لطف کوچہ دلدار کا سہی
کہتا ہے حال قبر کا دوزخ کا خلد کا

١٥

جادو کی سی ہے بولن نگہ شرمگیں نہیں
ہر دل تو سجے پاس یہ آفت کہیں نہیں
سنبھلو زمیں سے فلک ہے یقیں نہیں
کیونکر کہوں کہ نالہ دل آتشیں نہیں
افعی کی کینچلی ہے تیری آستیں نہیں
موج شراب تازہ ہے چین جبیں نہیں
کم سامری سے غمزہ سحر آفریں نہیں
حیراں ہوں شکر یہ نہیں انگبیں نہیں
لیکن وہاں مزار کے قابل زمیں نہیں
واعظ کے سر پہ تو کہیں روح الامیں نہیں

مجھ سا گناہ گار بشر اور لطف ہو
جنت بھی مل چکی مگر اتنک یقیں نہیں

نالے اگر کیے تو اڑاؤں گا خاک میں
یا آج آسماں ہی نہیں یا زمیں نہیں

چھپکے جو آنکہ ہجر کی شب میں تو کسطرح
او چھل ذرا نگاہ سے وہ مہ جبیں نہیں

دوزخ میں میں پلک کے پکاروں کہ یا کریم
آئے نہ تجھکو رحم یہ ہرگز یقیں نہیں

اے نظم کون حسن پرستی سے چھٹ رہا
قرآں اٹھائیے شیخ تو ہم کو یقیں نہیں

۱۰۷ ——— ——— ۱۴۳

کیا ہو یقیں ملیگا وہ ہم کو یہاں کہیں
اپنا ہی اس جہاں میں نہ پایا نشاں کہیں

مژگانِ تر سے تجکی چلے اے امینِ سحاب
ڈرتا ہوں اڑ نہ جائیں مری ہچکیاں کہیں

یارب وہ تیرگیِ شبِ غم کی ہوئی نمود
بنجائیے نہ سمٹ کی نہ بیل واں کہیں

سمجھے تھے ہم کہ سجدۂ طاعت ادا کیا
دیکھا تو سر کہیں ہے ترا آستاں کہیں

گنبد میں آسماں کی چھپا تھا قضا سے میں
کیا جانتا تھا یہ نہ ملے گی اماں کہیں

باتیں بنا بنا کے وہ مکرے تو کیا عجب
جس نے کہ ایک بات میں سو مکریاں کہیں

وقتِ غرور شیشہ سے مار کر ہی ڈرے
پتھر کی سل بنے نہ یہ خوابِ گراں کہیں

کیا سر کے بل گئے ہیں عدم کی سفر میں لوگ
اس راہ میں قدم کا نہ پایا نشاں کہیں

آواز ایک کی نہیں جا سکتی ایک تک
نالاں نہیں کہیں جرسِ کارواں کہیں

لے چل مجھے بھی اے شبِ عشرت تو اپنے ساتھ
ڈرتا ہوں تم قصاص نہ لے آسماں کہیں

دل اسطرح ہوائے محبت میں جل گیا
بھڑکی کہیں نہ آگ نہ اٹھا دھواں کہیں

عالم یہ ہجر میں ہے کہ بیٹھے کہیں ہیں ہم
اور دل ہے کہیں خیال کہیں ہے گماں کہیں

اے نظم سانپ کاٹ کے پلٹے تو کیا ہے غم
ہاں دیکھنا پلٹ کے نہ کاٹے زبان کہیں

۱۵

۱۰۸

تیور قدم قدم پہ مجھے آئے جاتے ہیں
اور دل کے ولولے ہیں کہ دوڑے آئے جاتے ہیں

ضد کر و زنگار بنا کا گلو سے تو
او سانپ ہیں کہ دوش پہ بل کھائے جاتے ہیں

کیا پھٹ پڑا رہا ہے دل زار رشک سے
وہ مرغ نامہ بر کو جو پر کاٹے جاتے ہیں

آہ آسماں پہاڑ کے تھگلی لگاتی ہے
نالے فراز عرش کو پھاڑے جاتے ہیں

گویا کہ آ گیا ہے ستاروں میں آفتاب
جتنے حسین ہیں سب وہ چھپے جاتے ہیں

دیوانہ میں ہوں اب کہ ہیں ناصح کوئی بتائیے
سمجھے نہ سمجھے کوئی وہ سمجھائے جاتے ہیں

آنکھوں میں رہتے رہتے وہ دل میں سمائیے
پائی جگہ تو پاؤں کو پھیلائے جاتے ہیں

بندہ تو اس ادا کا ہیں اہل کرم کی ہوں
دیتے ہیں اور آپ ہی شرمائے جاتے ہیں

اٹھا اٹھا دیکھنے ترے بام بلند کو
چکر فلک کو آج تک آئے جاتے ہیں

جھولا کریں مسیح ہنڈولے میں چرخ کے
ہم دور ہی سے دیکھ کے تیورائے جاتے ہیں

مجھ سے سوال کر کے نکیرین دنگ ہیں
حاضر جوابیوں سے وہ گھبرائے جاتے ہیں

باریک ہے جو بال سے وہ روش ہے وہ راہ
باندھی ہو کمر یہ ٹھہرنے کی جا نہیں
اور پاؤں ہارے خوف کے تھرّائے جاتے ہیں
ہم چلتے چلتے بات یہ سمجھائے جاتے ہیں

سب قافلہ تو جا بھی چکا نظم اب تو چونک
ایسے میں کچھ نشان قدم پائے جاتے ہیں

15 مفعول فاعلاتن دوبار 109

اس واسطے عدم کی منزل کو ڈھونڈتے ہیں
مدت سے دوستوں کی محفل کو ڈھونڈتے ہیں

یہ دل کے پار ہو کر پھر دل کو ڈھونڈتے ہیں
تیر نگاہ اس کے بسمل کو ڈھونڈتے ہیں

اک لہر میں نہ سمجھے ہم کیوں اسے حباب دیکھا
یوں آنکھ بند کر کے ساحل کو ڈھونڈتے ہیں

طرز کرم کی شاہد ہیں میوہ دار شاخیں
اس طرح سر جھکا کر سائل کو ڈھونڈتے ہیں

ہے وصل و ہجر اپنا اے قیس طرفہ مضموں
محمل میں بیٹھے ہیں اور محمل کو ڈھونڈتے ہیں

طول امل کا رستہ ممکن نہیں کہ طے ہو
منزل پہ بھی پہنچ کر منزل کو ڈھونڈتے ہیں

حسرت شباب کی ہے ایام شیب میں بھی
معدوم کی ہوس ہے زائل کو ڈھونڈتے ہیں

اٹھتے ہیں ولولے کچھ ہر بار درد بنکر
کیا جانیے جگر کو یا دل کو ڈھونڈتے ہیں

زخم جگر کا میرے ہے رشک دوستوں کو
مرتا ہوں میں کہ یہ کیوں قاتل کو ڈھونڈتے ہیں

اہل ہوس کی کشتی یک بام و دو ہوا ہے
دریائے عشق میں بھی ساحل کو ڈھونڈتے ہیں

آیا جو رحم مجھ پر اس میں بھی چال ہے کچھ
سینہ پہ ہاتھ رکھ کر اب دل کو ڈھونڈتے ہیں

کرتے ہیں کار فرہاد آساں زمیں میں بھی
مشکل پسند ہیں ہم مشکل کو ڈھونڈتے ہیں

اے خضر پے خجستہ بہر خدا کرم کر
بھٹکے ہوئے مسافر منزل کو ڈھونڈتے ہیں

دل خواہ تیرے عشوے دل جو ترے اشارے
وہ دل ٹٹولتے ہیں یہ دل کو ڈھونڈتے ہیں

اے نظم کیا بتائیں حج و طواف اپنا
کعبہ میں بھی کسی کی محمل کو ڈھونڈتے ہیں

۱۱۰ کیا کارواں ہستی گذرا روا روی میں ۲۰

فردا کو میں نے دیکھا گرد و غبار دی میں

تھے محو لالہ و گل کس کیف بیخودی میں

زخم جگر کے ٹانکے ٹوٹے ہنسی ہنسی میں

یاران بزم عشرت ڈھونڈوں کہاں میں تم کو

تاروں کی چھاؤں میں یا پچھلے کی چاندنی میں

ہر عقدہ میں جہاں کے پوشیدہ ہے کشائش

ہے موج خندۂ گل پنہاں کلی کلی میں

زخموں میں خود چمک ہے اور اس پہ یہ ستم ہے

رنگ پریدہ ہے میں رہتا ہوں چاندنی میں

ہم کس شمار میں تھے پرسش جو ہم سے ہوتی

یہ امتیاز پایا آشوب آگہی... میں

حکم قضا ہو جیسا سرزد ہو فعل ویسا

بندہ کا دخل بھی ہے پھر اس کی ہی بدی میں

رفتار سایہ کو ہے پست و بلند یکساں

ٹھوکر کبھی نہ کھائے راہ فروتنی میں

وجد آ گیا فلک کو غش آ گیا زمیں کو

وہ طرح کے اثر تھے
اک صوت سرمدی میں

تعبیر اس کی شاید
ایک واپسیں نفس ہو
جو خواب دیکھتے تھے
ہم ساری زندگی میں

لائی حباب تک کو
سیلِ فنا بہا کر
اک آہ کھینچنے کو
ایک دم کی زندگی میں

محشر کی آفتوں کا
دھڑکا نہیں رہا اب
سو حشر میں نے دیکھے
دو دن کی زندگی میں

پہلو میں تو ہوائے دل
پھر جستجو ہزار دل
کس بات کی کمی ہے
تیری سلامتی میں

پرسان حال وہ ہو
اور سامنے بلا کر
کیا جانیے زباں سے
کیا نکلے بیخودی میں

تو ایک ظلِ ہستی
پھر کیسی خود پرستی
سایہ کی پرورش ہے
دامانِ بیخودی میں

حائل بس اک نفس ہے
محشر میاں و ہم میں
پردہ حباب کا ہے
فردا میں اور دی میں

آنکھیں دکھا رہی ہے
دن سے مجھے شبِ غم
آثار تیرگی کے
ہیں دن کی روشنی میں

تو نے تو اپنے در سے مجھ کو اٹھا دیا ہے
پرچھائیں پھر رہی ہے میری اسی گلی میں
سجدہ کا حکم مجھ کو تو نے تو اب دیا ہے
پہلے ہی لکھ چکا ہوں میں خط بندگی میں
اے نظم چھیڑ کر ہم تجھ کو ہوئے پشیماں
کیا جانتے تجھے ظالم رو دیگا دل لگی میں

۱۱ فاعلاتن فاعلاتن فاعلاتن فاعلات ۱۱۱

صبح غم کی یہ شعاعیں نیشتر سے کم نہیں
چاک داماں سحر چاک جگر سے کم ۔۔ نہیں
حسن کی ترکیب دیتی ہے گلستاں کا جواب
قد شجر سے کم نہیں اعضا ثمر سے کم نہیں
زلف کا چہرہ پہ آنا ہے ستم ہنگام دید
ایک لمحہ بھر بھی مجھکو رات بھر سے کم نہیں
جھک گیا ہوں ضعف سے گردش ہے قسمت میں ہی
پاؤں کا چکر مرا دستار سر سے کم نہیں
میری از خود رفتگی بے روئے کم ہوتی نہیں
آپ میں آنا بھی دریا کے سفر سے کم نہیں

سجدہ کرتا تھا وہاں میں سر ٹپکتا ہوں یہاں
آستانِ یار بھی کعبہ کے در سے کم نہیں

کیا بتاؤں بادیہ پیما ہوں میں کس راہ میں
پاؤں میں جو آبلہ ہے وہ گہر سے کم نہیں

دل پہ بل کھانا ستم کا ہے بلا کا پیچ و تاب
بال بال اس زلف کا موئے کمر سے کم نہیں

اس میں رہتا ہے کسی کے روئے روشن کا خیال
خانۂ دل اپنا آئینہ کے گھر سے کم نہیں

انتہا رکھتا نہیں ہے گو شبِ فرقت کا طول
لیکن اپنا رنگ اڑ جانا سحر سے کم نہیں

منہ پہ منہ رکھ کر جو رویا پہنچے گوشِ یار تک
نظم اپنا ایک ایک آنسو گہر سے کم نہیں

۲۵ ۱۱۲

یاس و امید اس طرح ہے خاطرِ دلگیر میں
ہو اندھیرا اور اجالا جس طرح تصویر میں

دم بھی لے سکتا نہ انساں گردشِ تقدیر میں
گر کشش ہوتی نہ اتنی خاکِ دامن گیر میں

پاڑہ پیدا آنکھ کے سرمئے کی شمشیر میں
دیکھیے پلکوں کی صف نے پر لگائے تیر میں
دم نہیں ہے صید گاہ حسن کے نخچیر میں
آرزو میں دل میں ہیں دل ہے کسی کے تیر میں
ہو چکے ہیں خاک دونوں ہے ہوا چلنے کی دیر
صلح ہو جائیگی اب دارا و عالمگیر میں
عشق سکھلاتا جو یک روح و دو قالب کا عمل
جان اپنی ڈال دیتے ہم تری تصویر میں
صید کے دھوکے میں کیا جانے کیا تھا کس کو قتل
ڈال دیں قاتل نے باہیں گردن نخچیر میں
ابرؤوں میں تیرے ظالم اور کماں میں فرق ہے
کام ہوا تھے اشارہ میں تو اس کے تیر میں
رات کو تارے کھلے تھے صبح کو کلیاں کھلیں
واشد خاطر نہ تھی اک میری ہی تقدیر میں
وصف تیرا ایک سے بھی ہو نہیں سکتا بیاں
ہے زباں تقریر میں عاجز قلم تحریر میں
خرمن صبر و سکوں کی یا الٰہی خیر ہو

آج بجلی کی چمک ہے آہِ بے تاثیر میں
کعبہ و بت خانہ عارف کی نظر سے دیکھئے

خواب دونوں ایک ہی ہیں فرق ہے تعبیر میں
اُس کی ایک ایک بات کی دیتا ہوں میں سو سو جواب

طول موسیٰ نے دیا تھا جس طرح تقریر میں
آپ سے ہو کر مخاطب محو ایسا ہو گیا

عرض مطلب کو میں بھولا لذتِ تقریر میں
میں اگر زنداں سے اٹھا جان لے محشر اٹھا

اے جنوں شورِ قیامت ہے میری زنجیر میں
کہکشاں کے حلقہ حلقہ سے یہ مضموں ہے عیاں

باندھ کر رکھا ہے فیلِ مست کو زنجیر میں
جس قدر تڑپا اسیری اس قدر بڑھتی گئی

طوق آخر کو اُلجھ کر رہ گیا زنجیر میں
سر جو ٹکرایا تو دیواروں کو رنگین کر دیا

ایڑیاں رگڑیں تو ...... صیقل ہو گئی زنجیر میں
کم نہیں رختِ عروسی سے محرم کا لباس

لاکھ زیور کا مزہ ملتی سی اک زنجیر میں

کھل پڑے گیسو تو بندہ بنا اک مصیبت ہو گیا
زلف مشکل میں کبھی او لجھی کبھی زنجیر میں
زلف کے سودے میں آیا اوسکی آنکھوں کا خیال
اور دو حلقے زیادہ ہو گئے زنجیر میں
ہو رہی ہے قصر تن کی مہر و مہ سے پرورش
او ٹھ رہی ہیں درہم و دینار اس تعمیر میں
پڑھ کے کاجل سے بھی تجھ کا جل کا لگنا ہے ستم
سرمگیں آنسو لگا دیتا ہے پیکان تیر میں
اس نے دیکھا جب لگا کر دانت پر تلوار کو
آب گوہر مل گئی آب دم شمشیر میں
تجھ سے ہم کہتے تھے اے نظم منہ سے اُف نہ کر
ہو گیا کفران نعمت شکوہ تقدیر میں

۲۲ ۱۱۳

وہ دل ہے عشق کے بے پردگی ہوتی نہیں
اک چمک اوٹھتی ہے لیکن روشنی ہوتی نہیں
آئینہ دار خیال یار ہے جوش سرشک
کون سا شیشہ ہے وہ جس میں پری ہوتی نہیں

سو گئے اوٹھنے کا ترے کچھ اور ہی انداز ہے
اس طرح خورشید کی تیوری چڑھی ہوتی نہیں
جلنے والے جل کے رہ جاتے ہیں کیسا دیکھکر
صبح کو ہونٹوں پہ جب شب کی مسی ہوتی نہیں
کیا کہوں میں توڑتا شیشے سے ٹکرا کر اوسے
تو یہ زاہد بوقت میکشی ہوتی نہیں
وصل کی شب دل ہے میرا اور کسی کی کروٹیں
دیکھوں تو پامال حسرت کونسی ہوتی نہیں
شکوۂ بیداد پر کیا ہو تلافی کی امید
ناز ہوتا ہے اوسے شرمندگی ہوتی نہیں
آنکھ بھر کر دیکھنے سے اوس کے جو ہوتا ہے حال
ساغر سرشار سے یہ بیخودی ہوتی نہیں
دیدہ حیراں کے آگے ہوتی ہیں جو شوخیاں
محرم اس ناز و ادا سے آرسی ہوتی نہیں
ہے شب غم میں زمانہ میری نظروں میں سیاہ
کہہ رہا ہوں آج اب تک روشنی ہوتی نہیں
گوشۂ عزلت ہے جز رود عالم سے الگ

غم یہاں مرنے کا جینے کی خوشی ہوتی نہیں

یہ مرض ہستی کا اے خضر اور بے پرہیز تم
پی گئے آب بقا اب زندگی ہوتی نہیں

دل اٹھا لینے میں دنیا سے وہ ملتا ہے غنو
اہل دل کو اس سے بہتر دل لگی ہوتی نہیں

دولت کونین ملتی ہے جو طالب ہوں ابھی
اپنی ہمت ہی کہ اب تک ملتجی ہوتی نہیں

شبنم و گل برق و باراں جام و مینا کا ہے ساتھ
کس کے رونے پر زمانے میں ہنسی ہوتی نہیں

مل کے ابنائے زمانہ سے ملے کیا مجھکو لطف
دوستی نبھتی نہیں ہے دشمنی ہوتی نہیں

آسیائے چرخ ہے مدت سے اور عظم رمیم
قسمت اجزا ابھی تک منتہی ہوتی نہیں

سیدھی سادی راہ کوئی بیکسی کی راہ ہے
بیچ میں دیوار گرد نا کسی ہوتی نہیں

آئینہ کی طرح سب سے دل کو میں رکھتا ہوں صاف
خوب ہو یا زشت مجھ سے بیرخی ہوتی نہیں

غیر ممکن ہے کہ یک دل یک زباں ہو ساری خلق
جب کہ دو شخصوں کی صورت ایک سی ہوتی نہیں

پڑ گیا ہے پھیر کنہ معرفت کی راہ میں
دوڑتے سب ہیں رسائی ایک کی ہوتی نہیں

اس زمیں میں اور کچھ اشعار رندانہ سنا
تشنہ اہل ذوق کو سیری ابھی ہوتی نہیں

۱۲ ۱۱۴

دل نہ ہوتا گر تو پھر کچھ دل لگی ہوتی نہیں
غم کبھی ہوتا نہیں حسرت کبھی ہوتی نہیں

لوٹتے رہتے ہیں تجھ پر جانے والوں کے دل
ورنہ یوں پوشاک تیری ملگجی ہوتی نہیں

دور ہیں فصل خزاں کے آشیاں سے کیا غرض
پھونک دیتے ہم اگر بجلی گری ہوتی نہیں

کاتباں نامۂ اعمال نے دہرا دیا
ہم مر جاتے اگر لکھا پڑھی ہوتی نہیں

دل رہین عشق ہو کر پائمال ان کا ہو گیا
پھیر لیتے ہم اگر آئی گئی ہوتی نہیں

ہجر کی تاریک راتیں تھیں جو قسمت میں مری
کاش کے یہ چار دن کی چاندنی ہوتی نہیں

خون پی کر غم نہ کر دیتا اگر صید زبوں
اے اجل تجھ سے مجھے شرمندگی ہوتی نہیں

در کھلے ہیں آسماں کے می پرستوں کے لیے
ورنہ یوں تکلیف از خود رفتگی ہوتی نہیں

ہو گیا تنگ تعلق مانع سیر و سلوک
دوڑتے گر پاؤں میں مہندی لگی ہوتی نہیں

پھر اگر بچا خزاں سے جھک کے ہم کرتے سلام
سرو گلشن میں جو اتنی راستی ہوتی نہیں

ملنے والا تھا دل حسرت زدہ جس دن مجھے
کاش عالم میں وہ ساعت وہ گھڑی ہوتی نہیں

نظم جب تک ہو سکے ترک تشخص چاہیے
ہم خدا تجھ کو سمجھتے گر خودی ہوتی نہیں

۹ ولہ

حرص را خون کردن و دل را تونگر داشتن ۱۱۵
ایں عمل کم نیست از کبریت احمر داشتن

نسخهٔ تسخیر دلہائے جہان دانی کہ چیست

حرف شیرین و زبان چون موج کوثر داشتن

اے کہ میداری سفر در پیش و منزل با جہان گداز

زاد راہ تست دل از این جہان بر داشتن

تا نہادستی جبین عجز بر خاک نیاز

پس ترا زیباست سر تا آسمان بر داشتن

بر سر آوردن سپر در امتحان گاہ وفا

ہست مہر داغ رسوائی بہ مقصد داشتن

تا توانی دور کن زنگ ہوس از خاطرت

ورنہ آسان نیست چون آئینہ جوہر داشتن

شبہہ و شک در رہ تحقیق میدانی کہ چیست

خار در پیراہن و نشتر بہ بستر داشتن

تکیہ بر لطف خداوند یگہ ہست آمرزگار

بہتر از اندیشۂ کردار و کیفر داشتن

دوش احمد ہست معراج امیر بت شکن

پس چہ حاجت اندرون کعبہ و منبر داشتن

امن اس دورِ قمر میں فلکِ پیر نہیں / ہے کفِ افعیِ شب کاسۂ زنجیر نہیں

دل میں سمجھے ہوئے ہیں اپنے کہ ہم بھی کچھ ہیں / خواب وہ دیکھا ہے جسکی کوئی تعبیر نہیں

سیفِ قاطع ہے من اللہ تحمّلے احکامِ قضا / ہے یہ بسمل کی تڑپ حیلہ و تدبیر نہیں

آفریں خامۂ نغمہ و رنگیں گفتار / عندلیبوں کے ترانے ہیں یہ تحریر نہیں

باغ سبز اپنا دکھا ہمکو نہ اے طولِ امل / سمجھے بیٹھے ہیں کہ وقفہ نہیں تاخیر نہیں

دم شماری میں گزر جاتی ہے انساں کی عمر / اس میں تقدیم ذرا بھی نہیں تاخیر نہیں

---

۱۱ ۲۴

آپ کو میرے دلِ زار سے کچھ کام نہیں / خیر تو ہم بھی سہی تکرار سے کچھ کام نہیں

مشغلہ یہ بھی رہا دستِ جنوں کا چندے / اب گریباں کے کسی تار سے کچھ کام نہیں

زخم سے دور جو سینہ پہ پھری ہوئی بیٹھی ہیں / ہیں مسیحا جنھیں بیمار سے کچھ کام نہیں

رشکِ انجم سحری ہے ترا آویزۂ گوش / اس ستارہ کو شبِ تار سے کچھ کام نہیں

مجھ کو طوطی کی طرح ذوقِ نوا سنجی ہے / ورنہ آئینۂ رخسار سے کچھ کام نہیں

وعظ کہنے کو چلے آئے ہیں میخوار و نہیں / شیخ کو خانۂ خمار سے کچھ کام نہیں

ابر کی طرح سبک روح گذر جاتے ہیں / خلشِ وادیِ پُرخار سے کچھ کام نہیں

شعلۂ شمع نہیں ہوں میں ہوں دامانِ نسیم / مجھ کو خارِ سرِ دیوار سے کچھ کام نہیں

قلزمِ عشق کا پیراک نہیں ہیں نہ سہی / ڈوب مرنا ہے تو منجدھار سے کچھ کام نہیں

لکھتا ہے رازِ نہاں آتشِ جاں سوز مرا / اور زباں کہتی ہے اظہار سے کچھ کام نہیں

آنکھ بھر کر نگہ مست سے وہ دیکھ تو لے
پھر مجھے ساغر سرشار سے کچھ کام نہیں

تیغ کھینچے ہوئے رہتی ہے ادا ہر لحظہ
ہے ستم یہ کہ گنہگار سے کچھ کام نہیں

نفس بد کیا مجھے دنیا کی طمع دیتا ہے
تکیہ ہے فاقہ بھی ہر دار سے کچھ کام نہیں

میں طلبگار تجلی نہیں موسیٰ کی طرح
آتش لالہ کہسار سے کچھ کام نہیں

مرکز صبر و سکوں زیر قدم ہے اپنے
گردش گنبد دوار سے کچھ کام نہیں

سعد و نحس اپنا ہی اپنا ہی سکون میں و حرکت
کوکب ثابت و سیار سے کچھ کام نہیں

اپنا منہ اشک ندامت میں نظر آتا ہے
مجھ کو آئینہ پندار سے کچھ کام نہیں

اس کو بھرتی ہوئی دیکھا تھی الٹ جو شاید
گر گئے سرو کہ رفتار سے کچھ کام نہیں

اس کے جاتے ہی چلی جاتی ہے بھی گھر سے مرے
کہ مجھے اب در و دیوار سے کچھ کام نہیں

نیند آتی ہو تو یہ کہہ کے چلی جاتی ہے
کہ مجھے دیدہ بیدار سے کچھ کام نہیں

موج ماری جو غم دل تو فلک تک پہنچی
اس کو لیکن لب اظہار سے کچھ کام نہیں

رہزنی میں زن دنیا کا سلیقہ دیکھو
کہ اسے مرد سبکسار سے کچھ کام نہیں

کہہ دیا منکر رویت ہیں نافہموں نے
طالب وصل ہیں دیدار سے کچھ کام نہیں

میں جگر بند پیمبر کا ہوں شیدائی نظم
پسر ہند جگر خوار سے کچھ کام نہیں

۱۱۸ ——— ۱۰

کچھ غبار دل شیدا کی خبر ہی کہ نہیں
نظر اذا آئینہ بردوار دھرے ہے کہ نہیں

زخم ہونے کو ہی ہم یہ خبر ہی کہ نہیں
دیکھنا رات کچھ اسکی شمع سحر ہی کہ نہیں

نازکھو نگر یہ ہو گیسو کو تو بڑھکر دیکھے
دل وہی ہی ہی چھلا سی کمر ہی کہ نہیں

بیمروت نہ لگے دل کے یہ کہنا دیکھو
کیوں مرے سر کی قسم درد جگر ہی کہ نہیں

تجھکو نالوں سی ہو فرصت تو پوچھوں بلبل
دل لگاوی کا زرا نہیں ثمر ہے کہ نہیں

ہی شب کشتی کو ماتم میں فلک سوگ نشین
دیکھو تو چاک گریبان سحر ہی کہ نہیں

رات پھر اشک بہا تا نہیں کچھ یقین
دیکھو دامان و گریبان مرا تر ہی کہ نہیں

تم نی تو آنکھ بچھا لی ہی ہمیں تو دیکھو
آج تک تم پہ محبت کی نظر ہی کہ نہیں

اور جو راز تھی پنہاں وہ کھلا وصل کی رات
یہ نہ معلوم ہوا ہم کو کمر ہی کہ نہیں

ہائی افسوس نہ کہنا مرا مانا حیدر
یار کیوں مہر و محبت میں ضرر ہی کہ نہیں

۱۱۹

خم گیسو میں دل زار کو ہم دیکھتے ہیں
کس شکنجہ میں گنہ گار کو ہم دیکھتے ہیں

ہم نکلتی ہی یہ آنکھوں جو کھلی ہیں اپنی
بیمروت ترے اقرار کو ہم دیکھتے ہیں

بے پئے سیر جو کرتی ہیں انھیں لطف ہے خاک
ساقیا سبزہ و گلزار کو ہم دیکھتے ہیں

کچھ بغیر اس کے جو سنسان نظر آتا ہی
کس نظر سے در و دیوار کو ہم دیکھتے ہیں

ہائی کیا ہو گیا موقوف فلک کا پھرنا
ایک مدت سے شب تار کو ہم دیکھتے ہیں

اپنی قابو میں جو آجائے دل زار اپنا
پھر تری گرمی بازار کو ہم دیکھتے ہیں

صبح تو سر کے ٹپکنے ہی نہ ہوگی لیکن آج گرتے ہوئے دیوار کو ہم دیکھتے ہیں

نظم اب ترک محبت کا زمانہ ہے قریب

اور جانب نگہ یار کو ہم دیکھتے ہیں

۲۱ مفاعیلن چار بار ۱۳۰

نفس جب تک ہے آنکھیں دید و دید جہاں کر لیں

نہ دھاہے تار یہ جب تک تماشا تیلیاں کر لیں

اسیری میں بہار آئی ہے فریاد و فغاں کر لیں

نفس کو خونفشاں کر لیں قفس کو بوستاں کر لیں

گنہ اپنا سخندانی ہے گردوں قتل کے درپے

جو کہنا ہو وہ کہہ سن لیں جو کرنا ہو بیاں کر لیں

سفر تو اس قدر ہو دور کا اور پھیر کا رستہ

مناسب تھا کہ بے ناقہ کو محمل کو گراں کر لیں

حسینوں کی بہار حسن ہے مہمان دو روزہ

ادائیں گرمیاں کر لیں نگاہیں شوخیاں کر لیں

ضعیفی میں نہیں ہمکو شکایت قد کے جھکنے کی

زمیں سے کچھ دنوں فریاد و جور آسماں کر لیں

غرض ہے کسب عرفاں مجھکو میخانہ میں آنے سے

جنھیں طوفاں اٹھانا ہو وہ جو چاہیں گماں کر لیں

نہ آنا اے اجل تجھ کو قسم ہے وقتِ آخر تک
ابھی کچھ عمر باقی ہو اسے بھی رائیگاں کر لیں

خضر کو فاتحہ دینی ہی گر ہم خاکساروں کی
تو پہلے چشمۂ آبِ بقا سے کلّیاں کر لیں

خبر اس کی نہیں تھی دام زیرِ کاہ پنہاں ہے
ارادہ تھا کہ ہم بھی اس چمن میں آشیاں کر لیں

ہمارے ضبط کی گر پردہ داری دیکھنا چاہے
تو آ اے برق تجھ کو آشیاں میں ہم نہاں کر لیں

عجب کیا گر نہیں ملتا ہمارے سینہ میں تیر اُن کا
وہ ناوک پر قیاس معنیِ خاطر نشاں کر لیں

نہ ہو کوئی ہنر انساں میں اک شیریں زبانی ہو
یہ افسوں پڑھ کے دشمن کو بھی ہم تو مہرباں کر لیں

ہماری رندی و مستی تو قابلِ منع کے ٹھہری
سرِ منبر بھلا واعظ تو ٹھنڈی گرمیاں کر لیں

سمجھتے ہیں کہ جینا نزع کی حالت میں بھی اچھا
جو بس ہو تو اجل کو کچھ دنوں ہم میہماں کر لیں

بھلا کیا فائدہ اہل جہاں سے ہم سخن ہو کر
اثر اتنا تو ہو آخر کسی کو ہم زباں کر لیں

ہمیں اس بزم میں درد محبت گر نظر آئے
کلیجہ میں چھپا لیں اس کو آنکھوں سے نہاں کر لیں

مسیحا اُٹھ لے بالیں سے ذرا ٹھہر تم تیا اور تو ہے
ٹھہر اے درد دل اتنا کہ اور درد دل بیاں کر لیں

چلا ایں بزم سے پھر ذکر میرا نا مناسب ہے
شکایت میری جو کرنا ہو مجھ سے مہرباں کر لیں

ہوا یہ جب کہ ثابت عیش دنیا کا خیالی ہے
خیال عیش سے لازم ہے دل کو شادماں کر لیں

خزاں کے خوف میں گھلنے سے یہ اے نظم بہتر ہے
تماشائے گل و ریحان و باغ و بوستاں کر لیں

۲۰

۱۲۱

گزرتے ہیں تو مثل سیل عالم سے گزرتے ہیں
ٹھہرتے ہیں تو مثل نقش پانی پر ٹھہرتے ہیں

صبا کی طرح پھیرا کوچۂ ہستی کا کرتے ہیں
کہ آزادانہ آجاتے ہیں مستانہ گزرتے ہیں

زمیں سخت تھی گو کیا تو نے نگر یار سے
لگا دیتے ہیں تہمت جسے چاہا جسے دھرتے ہیں

مزاج زیست سے آئینہ ہوا کیا نا موافق ہے
کہ گرمی سے پگھل جاتے ہیں سردی سے ٹھٹھرتے ہیں

وہ کیا جانیں جو ہیں محروم لذت سے قناعت کی
غریبوں کے نوالے حلق سے کیونکر اترتے ہیں

نظر بر پارسا ہے حسرت نفس آ بستن تہمت
کوئی مرنے سے ڈرتا ہوگا ہم جینے سے ڈرتے ہیں

بڑی مشکل سے ہے نوبت یہ بھی ٹوٹی تو کیا زاہد
شکست سنگ کا الزام ہم شیشہ پہ دھرتے ہیں

عنادل اڑ چکے ہیں خاک میں جو کیا خبر ان کو
کہ شاخیں بھی تہی ہیں پھول تربت پر بکھرتے ہیں

یہ عادت کیا انہیں سے سیکھ لی ہے نکتہ چینوں نے
کہ جس پر آنکھ پڑ جاتی ہے اس کو نام دھرتے ہیں

مروت نو پہ کہتی ہے کہ بے دردی نہیں اچھی
ادا سمجھے ہوئے جاتی ہے کہ مرنے دو جو مرتے ہیں

تعجب ہے شیشہ نے پتھر کو توڑ ڈالا ۱۲

تمھارے گیسوؤں کی برہمی کچھ ہم نے دیکھی ہے
بگڑنے سے یہ بنتے ہیں بکھرنے سے سنورتے ہیں

حباب اٹھ کر قرار بحر[۱] سے تا سطح آب آیا
ابھرنے والے جو ہیں ناتواں ہو کر ابھرتے ہیں

اگر فقر و غنی کے مسئلہ کو غور سے دیکھو
تو سچ یہ ہے کہ دونوں لفظ بے معنی ٹھہرتے ہیں

قلم سے ذوق سجدہ جادۂ تسلیم میں سیکھو
جو ہیں اہل وفا یوں سر تہ شمشیر دھرتے ہیں

دھبے ہوں دل پہ جب چہرے کے صفائی پھر کہاں ممکن
کہیں یہ داغ مٹتے ہیں کہیں یہ زخم بھرتے ہیں

صدا طبل تہی کی ہے یہ شہرت اور یہ آوازہ
ہوا میں بھر کے ارباب ہوس ناحق ابھرتے ہیں

یہی دل ہے تو جینا ہو چکا اب عشق بازوں کا
تماشا ہے کسی کی شکل اچھی ہو یہ مرتے ہیں

ضعیفوں کے قد خم گشتہ ظالم وہ کمانیں ہیں
کہ جن کے تیر پشت چرخ گردوں سے گزرتے ہیں

[۱] قرار بحر دریا کی تہ ۱۲

نہیں ڈرتے زمانہ جتنا چاہے امتحاں کر لے
کھرے ہوتے ہیں جو وہ آگ میں گر کر نکھرتے ہیں
پرائے دل کی حالت کو کوئی اے نظمؔ کیا جانے
سمجھتے ہیں وہی جو دل پر اپنے ہاتھ دھرتے ہیں

۱۲۲ ۱۶

تری محفل میں جو آتے ہیں کچھ کھو کر نکلتے ہیں
وہ ہر سو ڈھونڈتے اپنا دلِ مضطر نکلتے ہیں
شگوفے لے کے سر پر طبلۂ عنبر نکلتے ہیں
گلِ تر ساتھ سلگائے ہوئے مجمر نکلتے ہیں
بہار آئی اوٹھا ہے جوشِ خونِ لالہ و گل میں
رگِ سودا میں ہم ڈوب کر نشتر نکلتے ہیں
کسی کے مطلعِ ابرو کو ہم نے پڑھ کے دیکھا ہے
عجب انداز پایا ہے عجب تیور نکلتے ہیں
شبِ غم اک بلائے بد ہے تارے میں گنوں کیونکر
ستارے بھی کچھ اس کے سایہ سے بچ کر نکلتے ہیں
جنھوں نے دل لگایا ہے نہیں یہ لطف کیا جانیں
اجل کس طرح آجاتی ہے دم کیونکر نکلتے ہیں

نہ پوچھو کاوشِ مژگاں سے تیرے دل پہ کیا گزری
کہ یہ آنسو وہی ٹوٹے ہوئے نشتر نکلتے ہیں

بیابانِ بلا کی راہ سیدھی مل گئی مجھکو
بگولے سیکڑوں کھاتے ہوئے چکر نکلتے ہیں

ہے اس بیمارِ غم کو دھن اوسی محفل میں جانے کی
مسیحا و خضر جس بزم سے مر کر نکلتے ہیں

بھری ہیں صانعِ قدرت نے موتی کوٹ کر تجھ میں
عرق جو شرم سے آیا وہی گوہر نکلتے ہیں

جو نایا تو حسینوں کے قدم تک تھا سرِ محشر
یہ ظالم حشر کے فتنہ سے بھی قد بھر نکلتے ہیں

مری فریاد اور الٹے گلا میرا دباتی ہے
مرے نالے مجھی پہ کھینچ کر خنجر نکلتے ہیں

بنائے جاتے ہیں کاجل کے دنبالے دمِ تزئیں
الٰہی خیر ہو تیرِ نگہ کے پر نکلتے ہیں

اشارہ ہے یہی اس شوخ کی ترچھی نگاہوں کا
انھیں گوشوں سے اکثر فتنۂ محشر نکلتے ہیں

نہیں گو شش سی کچھ دیوانگانِ عشق کو حاصل

کنواں کھودیں جو سر سے اس میں پانی بھی نکلتے ہیں

متاعِ صبر و ہوش اے نظم تو بیٹھا تو ہے لیکر

خبر بھی ہے کہ اس رستہ سے غارتگر نکلتے ہیں

ط ١٢٢

ثنائے ساقیِ کوثر میں شعر تر نکلتے ہیں

زمینِ شعر سے بھی چشمۂ کوثر نکلتے ہیں

غنیمت ہے نفس کے ساتھ جو اخگر نکلتے ہیں

یہی ارمان اپنے دل کے رہ رہ کر نکلتے ہیں

ازل میں نوحہ ماتم تھی مہ و خورشید سے پوچھو

کہ جب سے یہ نکلتے ہیں برہنہ سر نکلتے ہیں

زباں سے میری گر شکوہ نہیں نکلا نہیں نکلا

اک آوازِ شکستِ رنگ سے دفتر نکلتے ہیں

غبار آئے کسی کے دل میں تجھ سے کیا قیامت ہے

سنا ہوگا کہ اکثر گرد سے لشکر نکلتے ہیں

جہاں کو آئینہ سمجھیں طلسمِ قدرتِ حق کا

تو اک ذرہ سے سو بت خانہ آذر نکلتے ہیں

عبرت سے نقصان و کمال ماہ کو دیکھو

جو پہلے سر پہ پڑتے تھے وہ دبکر نکلتے ہیں

ہوائے دید لے اڑتی ہے مخمشہ ہو کہ گوشہ ہو

نفس میلوں میں ہم تخت سلیماں پر نکلتے ہیں

صدائے چنگ سے مجھکو یہی آواز آتی ہے

یہ کہتا ہے کوئی پردہ سے ہم باہر نکلتے ہیں

گدائے بے نوائی ایک ٹھوکر سے جو گرد اٹھے

ابھی لڑتے ہوئے دارا و اسکندر نکلتے ہیں

اوٹھائے ہیں جہاں میں داغ جو ہرگز نہ بھولونگا

یہ تیرے چند درہم اے فلک مجھ پر نکلتے ہیں

گذر جاتے ہیں یوں ہر روز سیہ ارباب ہمت پر

ستارے جس طرح بادل میں چھپ چھپکر نکلتے ہیں

نشانِ سوز غم باقی ہے میری خاک میں اب تک

دل پر داغ کے ٹکڑے ہیں جو اخگر نکلتے ہیں

کوئی دیکھے تو پہلے آپ سے باہر ذرا ہو کر

ابھی اس گنبد بے در میں صد ہا در نکلتے ہیں

دل بے آرزو جب سے ملا اے نظم حیراں ہوں

کسی کے منہ سے حرف آرزو کیونکر نکلتے ہیں

کھٹک ہر سانس میں ہے ہر نفس کے ساتھ نالے ہیں
کہ دل نازک ہے میرا اور دل کے زخم آلے ہیں

حیا میں ناز بھی ہے منہ پہ وہ آنچل جو ڈالے ہیں
ادا میں شرم بھی ہے اس طرح دامن سنبھالے ہیں

تری محفل میں مجھ سا کشتۂ حسرت نہیں کوئی
اداؤں نے مجھی پر حوصلے دل کے نکالے ہیں

حجاب آتے ہی مژگاں کی صفیں ہو جائیں گی برہم
یہ ترکان قدر انداز گھونگھٹ کھانے والے ہیں

طریق عشق میں ہر ہر قدم ہے کام اژدر میں
وہاں ہارے کے چھالے ہیں جو تلوؤں کے چھالے ہیں

نہ پہونچے فیض اپنوں سے تو شکوہ اسکا کیا کیجے
حباب بحر دست موج میں خالی پیالے ہیں

نہ ڈھونڈیں گے کہیں اب خانۂ دل کے سوا اسکو
مکاں کعبہ سے لیکر عرش تک سب دیکھے بھالے ہیں

جنھیں تکیہ خدا پر ہو زمیں پر کیوں قدم رکھیں
مصلے آب پر دوش ہوا پر مرگ چھالے ہیں

ملیں وحشت میں جاگیریں مجھے فرہاد و مجنوں کی
گریبانوں کے پرزے کوہ و صحرا کے قبالے ہیں

تری تصویر کو دیکھے ہوئے مدت ہوئی لیکن
مری آنکھوں میں ابتک کچھ اندھیرے کچھ اجالے ہیں

الٰہی رہ گئی تھی خاک میں بھی آہ کچھ باقی
مری مٹی سے جو ساغر بنے ان میں بھی چھالے ہیں

ملال انگیز ہو جاتی ہے افراط طرب آخر
کہ اپنی حد سے نغمے جب گذر جائیں تو نالے ہیں

قلم کی طرح سجدے ہی کروں میں تو اگر پاؤں
کہاں وہ لوگ ہیں جو بات پر سر دینے والے ہیں

کرم سے اس کے ہیں سامان کیا کیا بادہ نوشی کے
کبھی ساون کی جھڑیاں ہیں کبھی بھادوں کے جھالے ہیں

وہ ناداں ہیں جو ملک و مال کو اپنا سمجھتے ہیں
کہ یہ آج اس کے قبضہ میں ہیں کل اس کے حوالے ہیں

وہ اب کے سال ہر بوتل کا گا اوڑتی ہیں کیفیت
عمامے زاہدوں نے مست ہو ہو کر اچھالے ہیں

نہ چھوٹی مر کے بھی اہل جہاں سے ظاہر آرائی

کفن لگا رہے گا اور تابوت کے اوپر دوشالے ہیں

جہاں تو جلوہ گر ہووے ستم ضبط فغاں کرنا

مجھے آتا ہے ان پر رحم جو دل کو سنبھالے ہیں

جو پہلے جا چکے اس نظم میں ان کو تو کیا روؤں

بڑھے جاتے ہیں وہ آگے جو میرے ساتھ والے ہیں

١٣ ١٢٥

ہوئی ہے کثرت نشو و نما فصل بہاری میں

کہ بلبلیں دوڑتی ہیں نکہت گل کی سواری میں

مجھے فرقت کی شب یہ سوجھ ہے اختر شماری میں

ستارے کہکشاں میں ہیں کہ دندانے ہیں آری میں

گریباں پھاڑیئے گل کی طرح فصل بہاری میں

کہ دم گھٹنے لگا اب تو جنوں کی پردہ داری میں

حباب بحر ہیں ہم یا سراب دشت کچھ ہیں تو

کہ بوئے اعتبار آتی ہے اس بے اعتباری میں

مرے حصے میں جام جم نہ کیوں اس بزم میں آئے

کہ میں بھی تو ہوں یکتائے زمانہ بادہ خواری میں

[illegible] ہے کہ [illegible] ہو سکتا

تغیر آب رواں کی طرح ہے آب جاری میں
اوٹھانے کو دُر و گوہر کے میں ہر اک سے جھکتا ہوں
مجھے کان جواہر مل گئی ہے خاکساری میں
اجل نے تو مجھی چھوڑا اک صید زبوں یہ ہے
یہاں دشوار جینا ہو گیا اس شرمساری میں
پشیماں ہوں کہ تجھکو شاہ خوباں کیوں کہا میں نے
نہ کی بھر بات ہی مجھ سے غرور شہریاری میں
ٹھہر اے سیل گریہ ہی جو عکس یار کی طالب
صفائی کی ہے صورت غیر ممکن بیقراری میں
غریب آزار کو فرعون اہل دل سمجھتے ہیں
وہ تخت عاج پر نکلے کہ سونے کی عماری میں
ہے اس سفاک کا بھی سامنا محشر میں اے حیدر
خدا جانے کہوں کیا عالم بے اختیاری میں

١٠

١٢٦

ابھی تک بحث امر کن فکاں جاری ہے عالم میں
فنا اک دم میں ہی سارا جہاں موجود اک دم میں
یعنی فیضان وجود ہر آن میں نہ ہوتا ہو تو عالم فنا ہو جائے آفتاب کی شعاعوں

جوانانِ چمن اترا نہ جائیں حسن پر اپنے

جہاں کی بے ثباتی آئینہ ہے دستِ شبنم میں

مری آنکھوں کے آگے تو نہ کر خوں اے اجل انکا

چھپا رکھی تھیں میں نے آرزوئیں جانِ پر غم میں

کرو نیکی کسی سے مفت سب ممنون منت ہوں

جہاں ڈوبا ہوا ہے چشمۂ احسان حاتم میں

سلیمانِ جہاں سمجھوں نہ کیوں اہلِ مروت کو

تبسم ہے لبِ رنگیں پہ جیسے نقش خاتم میں

حیا دی ہے خدا نے آنکھ میں اہلِ سعادت کی

نگہ ہے پرورش پائے ہوئے دامانِ مریم میں

غریب اہلِ دنیا سے نہیں مردِ خدا ڈرتے

حقیقت حیلہ روباہ کی کیا چشمِ ضیغم میں

مجھے اس عالمِ افتادگی میں رشک آتا ہے

کہاں سے آ گئی یہ طاقتِ پرواز شبنم میں

عجب ہے بزم ہی میں سیر کرنا سارے عالم کی

کوئی قطرہ شرابِ عشق کا تھا ساغرِ جم میں

بقیہ ہمکا سلسلہ ذرا موقوف ہو تو دنیا تاریک ہو جائے گی یوم ہو نی شان ۱۲ع

ملی شاہ و گدا کی خاک تو ہوتی تھیں یہ باتیں
ملاپ آخر ہوا اک عمر کے بعد آپ میں ہم میں

۲۰ فاعیل مفاعیل مفاعیل مفاعیل

۱۲۷

گمراہ کیا نفس نے دنیائے دنی میں
رہزن کا مرا ساتھ ہے اس ہم وطنی میں

تنہا نہ ملا گوشہ مرقد بھی کسی کو
سنتے ہیں کہ کشتی ہوئی درویش و غنی میں

مقتل میں مجھے یوں جگر و دل نظر آئے
یہ تیر[۱] کے پیکاں میں وہ برچھی کی انی میں

سینہ میں ٹھہرتا نہیں دم تا بہ دم مرگ
کیا یاس و تپش ہے امر شدنی میں

آئے تو کسی طرح سے اس بت کو تبسم
بجلی کی چمک دیکھ لو ہیرے کی کنی میں

جس نخل کو یہ سیل فنا دیتی ہے پانی
مصروف اوسی نخل کی ہے بیخ کنی میں

لازم ہے کہ دامان و گریباں میں ہے چاک
ہے موسم گل لطف ہے گل پیرہنی میں

کچھ پیر مغاں سے تجھے نسبت نہیں زاہد
ہوتا ہے بڑا فرق کرم اور دنی میں

رنگت تری لب کی ہے نزاکت نہیں لیکن
یاقوت بدخشاں نہ عقیق یمنی میں

بجلی سی چمک جاتی ہے پھرتا ہے جو توسن
شاید دل بیتاب ہے برچھی کی انی میں

اک بات کی جس سے ہوا کشتہ حسرت
کیا زہر گھلا ہے تری شیریں سخنی میں

قبلہ سے جو نور کی اٹھی ہیں گھٹائیں
ڈوبا ہے چمن رنگ عقیق یمنی میں

کہنے میں نہ ہو نفس تو کر قتل کی تدبیر
کیا فرق ہے گردن کش و گردن زدنی میں

[۱] تیر اور برچھی مژہ اور نگاہ کے معنی میں ہے ۔ ۱۲

ہے نفس کی اصلاح تو بس نفس کُشی میں
ہر گز سخن تلخ میں دیکھی نہیں یہ بات
ساتھ آئی ہے کچھ گرد کدورت جو وطن سے
چلتے ہیں وہ اب تک رہ اسہارے پہ قلم کے
مل جائیگا محشر میں دل اس عربدہ جو سے
کافر ہوں کسی بات کا مجھکو جو یقیں ہو
کرتے ہیں وہ ظلم اور پشیماں نہیں ہوتے

کچھ دل کی درستی ہے تو بس دل شکنی میں
کچھ کام نکلتا ہے تو شیریں سخنی میں
پروا مجھے مرقد کی نہیں بیوطنی میں
جو شہرہ آفاق تھی شمشیر زنی میں
عادت یہ ہمیشہ کی ہے اس ناشمنی میں
ملتا ہے مزہ آپ کو پیماں شکنی میں
سمجھے ہیں کہ آواز نہیں دل شکنی میں

۲۱

۱۲۸

اندیشہ ہے رہزن کا بھی ہر راہ گذر میں
آنکھیں ہیں مری یوں محو تماشا میں وہ تو
کہتے ہیں غلط تیر لگا یا نہیں تو نے
افسانہ رہا محفل عشرت کا ہمیشہ
پر خوف یہ منزل ہے سکبار گذر جا
ہیں شہر خموشاں میں کسی جا کے پکاروں
دیتا ہے وہ نعمت تو اٹھائی نہیں اٹھتی
گر اہل جہاں داغ اٹھائے نہیں جاتے
بچپن سے جوانی ہے جوانی سے بڑھاپا

اس طرح سے غافل کوئی سوتا ہے سفر میں
وہ داغ تھے گویا پر طاؤس نظر میں
خود میں نے چھپایا ترے ناوک کو جگر میں
وہ شمع کا جلوہ نہ رہا رات ہی بھر میں
برسوں سے یہ آتی ہے صدا راہ گذر میں
در ہے مگر آواز نہیں حلقہ در میں
پھولوں سے لچک آگئی شاخ گل تر میں
پھر کس لئے پیدا ہوئی اس دور قمر میں
ہے خاتمہ عمر اسی شام و سحر میں

کیوں نامۂ یار آنکھوں سے اپنی نہ لگاؤں
بھیجا ہو جسے باندھ کے جبریل کے پر میں

ہستی مری عرفاں کو کسی طرح سنبھالے
ایسا بھی ہے ہشیار کوئی اہل خبر میں

اس راہ میں دم نکلے تو کافور سے کیا کام
کر دینا مجھے دفن اسی گرد سفر میں

کس طرح عنادل کے گلے میں اتر آئے
نغمے تھے نہاں پردۂ برگ گل تر میں

یہ شیشہ گری ابر نے کی ہے کہ ہوا نے
خلخال بلوریں ہے ہر اک ساق شجر میں

منظور اگر ہو دل مردہ کو جلانا
ہے معجز عیسی نفس باد سحر میں

حسرت ہے کبھی عمر گذشتہ کو کریں یاد
مہلت ہمیں اتنی نہ ملی آٹھ پہر میں

گھیرے ہوئے ہے خلق کو یوں نعمت خالق
جسطرح سے جوئی کا ہو گھر تنگ شکر میں

نکلا نہ کسی سوزن مژگاں سے صدا کام
برسوں ہی کھٹکتی رہی اک پھانس جگر میں

کہتی ہے یہ دانتوں کی چمک وقت تبسم
ڈورے کی جگہ برق ہے اس عقد گہر میں

ہے اس کی ادا قاتل عالم وہ رفتار
تلوار لگا دی ہے نزاکت نے کمر میں

اس بزم میں ہے نظم جنہیں لطف نہ آئے
حافظ کی غزل میں نہ رباعی عمر میں

۱۵

۱۲۹

مفتعلن مفاعلن (۲) بار

سنگ جفا کا غم نہیں
دست طلب کا ڈر نہیں

اپنا ہے اس پہ آشیاں
نخل جو بار ور نہیں

سنتے ہو اہل قافلہ میں کوئی راہبر نہیں
دیکھ رہا ہوں تم میں سے ایک بھی راہ پر نہیں

موت کا گھر ہے آسماں اس سے کہیں مفر
نکلیں تو کوئی در نہیں بھاگیں تو رہگذر نہیں

پہلے جگر پہ آہ کا نام نہ تھا نشان نہ تھا
آخر کار یہ ہوا آہ تو ہے جگر نہیں

صبح ازل سے تا ابد قصہ نہ ہوگا یہ تمام
جور فلک کی داستاں ایسی بھی مختصر نہیں

برگ خزاں رسیدہ ہوں چھیڑ نہ مجھکو اے نسیم
ذوق فغاں کا ہے مجھے شکوۂ اثر نہیں

منکر حشر ہے کدھر دیکھے تو آنکھ کھول کر
حشر کی جو خبر نہ دے ایسی کوئی سحر نہیں

شبنم و گل کو دیکھکر وجد نہ آئے کسطرح
خندۂ بے سبب نہیں گریۂ بے اثر نہیں

تیرے فقیر کا غرور تاجوروں سے ہے سوا
طرف کلہ میں دے شکن اس کو یہ دردِ سر نہیں

کوشک و قصر و بام و در تو نے بنا کئے تو کیا

حیف ہے خانماں خراب دل میں کسی کے گھر نہیں

نالہ کشی رقیب ہے میری طرح محال ہے
دل نہیں حوصلہ نہیں زہرہ نہیں جگر نہیں

شاطر پیر آسماں واہ ری تیری دستبرد
خسرو و کیقباد کی تیغ نہیں کمر نہیں

شان کریم کی یہ ہے ہاں ہے ہو پیشتر عطا
لطف عطا کا کیا ہو جب ہاں ہے ہو پیشتر نہیں

لاکھ وہ بیرخی کرے لاکھ وہ کج روی کرے
کچھ تو ملال اس کا ہے دل کو ہرد مگر نہیں

سن کے برا نہ مانیے سچ کو نہ جھوٹ جانیے
ذکر ہے کچھ گلہ نہیں بات ہے نیشتر نہیں

حرف واو

۳۰ مفاعیلن چار بار ۱۳

ندامت ہے بنا کر اس چمن میں آشیاں مجھ کو
ملا ہمدم یہاں کوئی نہ کوئی ہمزباں مجھ کو

ہلال برق سے رکھ ہم رکاب وہم عناں مجھ کو
بنایا ناتوانی نے سلیمان زماں مجھ کو

اڑا کر لے چلے موج نسیم بوستاں مجھ کو
وہ صبح ازل سے میں نوا سنجوں میں ہوں ایسے

سکھایا بلبل سدرہ نے انداز فغاں مجھ کو
میری باتوں میں کیا معلوم کب سوئے وہ کب جاگے

سرے سے اس لئے کہنی پڑی پھر داستاں مجھکو
بہا کر قافلہ سے دور جسم زار کو پھینکا

کہ موج سیل تھی بانگ درائے کارواں مجھکو
یہ دل کی بیقراری خاک ہو کر بھی نہ جائے گی

سناتی ہے لب ساحل سے یہ ریگ رواں مجھکو
اڑائی خاک جس صحرا میں تیرے واسطے میں نے

تھکا ماندہ ملا ان منزلوں میں آسماں مجھکو
تصور شمع کا جس کو جلا دے ہوں وہ پروانہ

لگی اٹھی آگ دل میں جب نظر آیا دھواں مجھکو
لئے میں پھر عرصۂ محشر تک آیا ناتواں ہو کر

کہاں سے حسرت دیدار لے آئی کہاں مجھکو

وہ جس عالم میں جا پہونچا وہاں میں کسطرح جاؤں
ہوا دل آپ سے باہر پہنا کر بیڑیاں مجھکو
غبار راہ سے اے نظم یہ آواز آتی ہے
گئی اے عمر رفتہ تو کدھر پھینکا کہاں مجھکو

۱۲ ۱۳۱

نہیں پروا جو ظالم نے مٹایا میری تربت کو
لحد بن جائے گر ظاہر کروں دل کی کدورت کو
کسی نے شعلہ ساں آنچل میں باندھا ہو شرارت کو
گرہ میں باندھے ہے اب مثل اخگر داغ حسرت کو
ترے ممنون ہم سب رند اے باد بہاری میں
اوڑا لاتی ہے میخانہ پہ تو باران رحمت کو
یہ وہ دن ہیں کہ اب آنکھوں کو اپنی ڈھونڈتے ہیں ہم
گئے وہ دن کہ آنکھیں ڈھونڈتی تھیں اسکی صورت کو
نکل جاتا ہے نام اک شعر اگر اچھا نکل آئے
یہ دو مصرع تو گویا پر لگا دیتے ہیں شہرت کو
ہوا سالک کو حاصل کیا دو صد زانو تامل سے
کہ دیکھا گام اول میں یا دو صد آئینہ حیرت کو

نگاہ آشنا کو دیکھ کر منہ پھیر لیتے ہیں
پس پشت اپنے گویا ڈھونڈھتے ہیں مروت کو

حسینوں کو کیا گرویدہ اس نے آئینہ بن کر
دل وارفتہ نے جس طاق پر رکھا تھا حیرت کو

کہیں الزام محشر میں نہ ہو اس پر تغافل کا
میرے لاشہ پہ لے آئے کوئی اس بیمروت کو

پلک جھپکاتے نرگس کو نہ دیکھا باغ میں ہم نے
جو آنکھیں ہوں تو بس دیکھا کرے صانع کی قدرت کو

بیاباں ہو ابھی زنداں میں پیدا ہے یہ اندیشہ
جھٹک دوں میں اگر دامن سے اپنی گرد کلفت کو

نہ تھی لے نظم تدبیر اور نہ کچھ دل کے بہلنے کی
گریباں سے نہ الجھاتا اگر میں دست وحشت کو

۱۳۱ — ۱۳۲

عجب شوریست از حرف دل دیوانہ در پہلو
شب ما زندہ می دارد ہمیں افسانہ در پہلو

خوشم آید ز ساغر خندۂ سرشار بر رویم

وفور مستی من کرد برهم وضع محفل را
در آغوش است ساقی شیشه و پیمانه در پهلو

نمی دانم چه افسوں کرد بر من نشئهٔ ہستی
نگاہم محو غیر و جلوهٔ جانانه در پهلو

خوشا عرفاں اگر از ماسوا پہلو تہی کردی
به بیں گز گنج خالی نیست ایں ویرانه در پہلو

زدم بر شمع بالیں آستینے در شب ہجراں
دلم می سوخت بر بیتابی پروانه در پہلو

بشمع قامتِ آں ترک حسن فتنه زا باشد
که خود تیغش بلرزد چوں پر پروانه در پهلو

تنم را زار کرد است آنچناں سودائے زلفِ او
نمایاں استخوانہا گشته مثلِ شانه در پہلو

بشر در انقلابِ دہر گوئی در غلطان است
بہر پہلو که غلطد دارد آب و دانه در پہلو

ہمانا چارهٔ داغ دل از مرہم نمی آید
که دارم پنبه بر پہلو و آتش خانه در پہلو

دلم محو طلب است ...

ہوائے کعبہ در سر دارم و بت خانہ در پہلو

خوشا وقت قدح خواری کہ گردش می کند باہم

برقصش ساغر و ہم سبحہ صد دانہ در پہلو

چہ طور راز سکار ہتیا کہ بنوشتم باد آخر

کہ ہر یک نقطہ دارد معنی بیگانہ در پہلو

چو گل با خار بینی جائے فریاد است ائے حیدر

کہ دل سوزد لبش پر خندہ و بیگانہ در پہلو

۲۵

عبث ہے ناز استغنا پہ کل کی کیا خبر کیا ہو ۱۲۳

خدا معلوم یہ ساماں کیا ہو جائے سر کیا ہو

یہ آہ بے اثر کیا ہو یہ نخل بے ثمر کیا ہو

نہ ہو جب درد ہی یارب تو دل کیا ہو جگر کیا ہو

جہاں انسان کھو جاتا ہو خود پھر اسکی محفل میں

رسائی کس طرح ہو دخل کیونکر ہو گذر کیا ہو

نہ پوچھو لا گا میں بھی جام ہے زہر یا امرت

تمہارے ہاتھ سے اندیشہ نفع و ضرر کیا ہو

مروت سے ہو بیگانہ وفا سے دور ہو کوسوں

یہ سچ ہے نازنین ہو خوبصورت ہو مگر کیا ہو

شگوفے دیکھ کر مٹھی میں زر کو مسکراتے ہیں
کہ جب عمر اس قدر کوتاہ رکھتے ہیں تو زر کیا ہو

رہا کرتی ہے یہ حیرت مجھے زہد ریائی پر
خدا سے جو نہیں ڈرتا اوسے بندہ کا ڈر کیا ہو

کہا میں نے کہ تم مبتلا مرتا ہے حسرت میں
کہا اوس نے اگر مر جائے تو میرا ضرر کیا ہو

کہا میں نے کہ ہے سوز جگر اور اف نہیں کرتا
کہا اس کی اجازت ہی نہیں پھر نوحہ گر کیا ہو

کہا میں نے کہ دے اوس کو اجازت آہ کرنے کی
کہا اوس نے بھڑک اٹھے اگر سوز جگر کیا ہو

کہا میں نے کہ آنسو آنکھ کا لیکن نہیں تھمتا
کہا آنکھیں کوئی تلووں سے مل ڈالے اگر کیا ہو

کہا میں نے قدم بھر پر ہے وہ صورت دکھا آؤ
کہا منہ پھیر کر اتنا کسی کو دردسر کیا ہو

کہا میں نے اثر مطلق نہیں کیا سنگدل ہے تو
کہا جب دل ہو پتھر کا تو پتھر پہ اثر کیا ہو

کہا میں نے جو مر جائے تو کیا ہو سوچ لو دل میں
کہا نا عاقبت اندیش نے کچھ سوچ کر کیا ہو
کہا میں نے خبر بھی ہے کہ دی جان اوس نے گھٹ گھٹ کر
کہا مر جائے جیسکی سی تو پھر مجھ کو خبر کیا ہو

۱۴ ۱۲۴

مجھی کو کہہ رہے ہو سب کہ سرگرم فغاں کیوں ہو
کوئی اس سے نہیں کہتا کہ تم نامہرباں کیوں ہو
نہ کھینچ اے چارہ گر پیکان قاتل میرے سینے سے
ملیں یوں دل سے دل باہم تو کوئی درمیاں کیوں ہو
سرائے دہر میں ٹھہرے تو پھر شکوہ شکایت کیا
جسے خون جگر کھانا ہو وہ مہماں کیوں ہو
یکایک پھیر لینا آنکھ کا بس قہر ڈھاتا ہے
اگر کہہ سن کے بگڑو بھی تو مرگ ناگہاں کیوں ہو
ملے گی داد کیا محشر میں ہم کو اس ستمگر سے
نہیں ہونا ہوا کچھ تو پھر شور و فغاں کیوں ہو
قیامت آج ہی آ جائے صور حشر پھنک جائے
شب غم میں سحر کیوں صبح کی نوبت اذاں کیوں ہو

جب اپنی خو یہ ٹھہرے منہ میں جو آئے سو کہہ جاؤ
تو پھر کہنا کسی کا طبع نازک پر گراں کیوں ہو

اشارہ میں گلِ نرگس نے پوچھا اسکی آنکھوں سے
فدا میں تم پہ تم بیمار کیوں ہو ناتواں کیوں ہو

نہ دیوانوں کے منہ لگ تو نہ ایسی گت بنی ناصح
اڑیں دامن کے کیوں پرزے گریباں دھجیاں کیوں ہو

وہ میرا جستجو میں اس کی جانا بزم خوباں میں
اور اس کا بدگمانی سے یہ کہنا تم یہاں کیوں ہو

اسے بے مانگے ہی دینے کی عادت تو نے ڈالی ہے
تو شرمندہ کسی کا پھر گدائے آستاں کیوں ہو

سمجھ لے دہر کو جاتا ہوا سیلاب ہے ورنہ
حباب آسماں کے ساتھ موج کہکشاں کیوں ہو

خبر لو ایک رنگ آتا ہے اک جاتا ہے چہرہ کا
تلون گر نہ ہو تو تیوریوں میں وہ چپاں کیوں ہو

تڑپنا نیم بسمل ہو کے حیدر تھا مقدر میں
رگے میں جب وہی مجھ سے تو پھر خنجر رواں کیوں ہو

۱۰ مفاعلن فعلاتن مفاعلن فعلات

ملے ہیں نقش جو ہم بوریا نشینوں کو
وہ دستیاب نہیں شاہوں کے نگینوں کو

کیا ہے صاف دلوں کی جو دوربینوں کو
تو سات پردوں میں دیکھا کئے حسینوں کو

ہزار طرح سے پہلو تہی وہ کرتا ہے
کہیں جگہ نہیں ملتی ہے ہم نشینوں کو

گلہ بھی اس کے تغافل کا ہو نہیں سکتا
غرور و ناز ہی زیبا ہے نازنینوں کو

چمن کی سیر مبارک ہو تجھ کو اے نرگس
کسے یہ تاب کہ دیکھا کرے حسینوں کو

جہاں جہاں مری فکر بلند کا ہے عمل
نہ آسمان سے بدلوں میں ان زمینوں کو

ہوش رہی نہیں دولت کی خاکساری میں
کہ اس زمین نے سرکا دیا دفینوں کو

بتا دیا ہے ہمیں ساقیِ ازل نے یہی
کہ اپنے رنگ میں تو کھینچ ہم نشینوں کو

نہ پوچھ بادِ صبا موسمِ خزاں کا ملال

بسر کیا ہے بری طرح ان مہینوں کو
چھپائیں چاند کو کیا خاک ڈال کر اے نظم
بھلا میں دل کی کدورت سے مہ جبینوں کو

١٨

کیا شراب نے رنگین آبگینوں کو ١٣٦
تو رنگ دیا ترے ساعد نے آستینوں کو
ہوس مقابلہ کی اوس سے تھی حسینوں کو
صفیں الٹ گئیں الٹا جو آستینوں کو
خدا کرے نہ کسی کو کسی کا دست نگر
کہ بار بار چڑھاتے ہیں آستینوں کو
قبائے یار سے کس طرح دیجے ہم تشبیہ
قبائے گل میں نہ دیکھا تھا آستینوں کو
جہاں سے اہل ہوس ہاتھ اٹھا نہیں سکتے
ہزار بار چڑھایا ہے آستینوں کو
کوئی غبار کے پردے میں ہو نہ دامن گیر
الٹ لے آئینہ پردار آستینوں کو
نشاں بن گئے ہیں نازکی سے ہاتھوں میں

قبا جو پہنی ہے چنوا کے آستینوں کو

غرض کسی نہ کسی طرح چنگیاں لینا
کوئی یہ جانے کہ چنتے ہیں آستینوں کو

بہار دیدۂ خونبار کا ہوں میں مفتوں
کہ شاخ گل سے ہے تشبیہ آستینوں کو

نہ رکھا تار گریباں میں نہ دامن میں
الٹ کے پنجۂ وحشت نے آستینوں کو

رہا جنوں میں بھی مجھ کو لحاظ پردہ دری
دیا ہے چاک گریباں کا آستینوں کو

ہے اوج فقر یہ زاہد جہاں سے کھینچ کے ہاتھ
بنا لیا پر پروانہ آستینوں کو

جو بزم میں ہو تماشائے رقص اوسے منظور
لگا لے جامۂ فانوس آستینوں کو

کنار جو نظر آتا ہے پنجۂ مرجاں
حنا ہے مل کے حنا اس نے آستینوں کو

خبر ہی ہے سبب کسر شان ہے چین جبیں
شکن ہے جیسے ہو کوتاہی آستینوں کو

بنایا اشکوں نے دامن کو دامن دریا
بجا ہے موج سے تشبیہ آستینوں کو

کمال حسن ہے دست ہوس کی کوتاہی
شکن نہ زیب دے کس طرح آستینوں کو

ہر ایک شعر ہیں چیدہ ہیں مصرع اے حیدر
چنا ہے شاہد مضموں کی آستینوں کو

۱۲۷ ——— مفعول فاعلات مفاعیل فاعلات ——— ۱۵

اتنا تو میں ضرور کہوں گا خفا نہ ہو
بے مثل حسن میں ہو اگر بے وفا نہ ہو

آئینہ کہہ رہا ہے کہ ہو محو ناز تو
سمجھا رہی ہے شرم کوئی دیکھتا نہ ہو

ہستی فقط تصور ہستی کا نام ہے
زندہ نہیں ہے وہ جسے یاد خدا نہ ہو

وہ آدمی نہیں ہے جو خالی ہو درد سے
اس دل کو دل نہ جانیے جو مبتلا نہ ہو

منکر ہر ایک شے سے اسی کا ظہور ہے
اس کا علاج کیا جو تجھے سوجھتا نہ ہو

وہ بھی ہیں لوگ حشر میں جنکو ہے شوق دید
ڈرتا ہوں میں خدا انکا کہیں سامنا نہ ہو

اغیار تو ہوں ساقی مہوش شریک دور
پہروں کھڑے رہیں تو ہماری صلا نہ ہو

بھولا ہوا ہے حیف تعہد الست کو
ممکن ہے یہ کہ مر کے بھی وعدہ وفا نہ ہو

ہے زیست وہ پہاڑ جو کاٹے نہ کٹ سکے
اس راہ میں اگر فرس بادپا نہ ہو

دریائے بے کنار ہو اور آگ میں نہا لے
جز دیدۂ احباب کوئی آشنا نہ ہو

اس دشت سے گزر تو سبکبار ہی گزر
پھیلاؤ اتنا پاؤں نہ دنیا کو دیکھ کر
کیا ہو گئے وہ چہچہے وہ گلبانگ بلبلیں
مشکل پسند میری طبیعت ہے شیفتہ میں

اس طرح جائیے کہ کہیں نقشِ پا نہ ہو
گھر جس کو اپنا سمجھے ہو مہماں سرا نہ ہو
کیا چاندنی کا لطف جو وہ مہ لقا نہ ہو
جاتا ہوں اس طرف کہ جدھر راستا نہ ہو

حیراں ہوں میں دعا ہے کہ یہ کوسنا ہے نظم
کہتے ہیں مجھ کو دیکھ کے تیرا برا ہو

فاعلاتن فاعلاتن فاعلاتن فاعلات

۱۳۸ ۱۴

مجھ کو سمجھو یادگارِ رفتگانِ لکھنؤ
ہوں قدِ آدم غبارِ کاروانِ لکھنؤ
خونِ حسرت کہہ رہا ہے داستانِ لکھنؤ
رہ گیا ہے اب یہی رنگیں بیانِ لکھنؤ
گوشِ عبرت سے سنے کوئی مری فریاد ہے
بلبلِ خونیں نوائے بوستانِ لکھنؤ
میرے ہر آنسو میں اک آئینہ تصویر ہے
میرے ہر نالہ میں ہے طرزِ فغانِ لکھنؤ
ڈھونڈھتا ہے اب کسی لے کر چراغِ آفتاب
کیوں مٹایا اے فلک تو نے نشانِ لکھنؤ

لکھنؤ جن سے عبارت تھی ہوئے وہ پائمال

ہے نشانِ لکھنؤ باقی نہ شانِ لکھنؤ

اب نظر آتا نہیں وہ مجمعِ اہلِ کمال

کھا گئے ان کو زمین و آسمانِ لکھنؤ

پہلے تھا اہلِ زباں کا دور اب گردش میں ہیں

چاہیئے تھی تیغ اردو کو فسانِ لکھنؤ

مرثیہ گو کتنے یکتائے زمانہ تھے یہاں

کوئی تو تابوت میں ہوتا نوحہ خوانِ لکھنؤ

یہ غبارِ ناتواں خاکسترِ پروانہ ہے

خاندان اپنا تھا شمعِ دودمانِ لکھنؤ

چلتا تھا جب گھٹنیوں اپنے یہاں طفلِ رضیع

سجدہ کرتے تھے اُسے گردن کشانِ لکھنؤ

عہدِ پیرانہ سری میں کیوں نہ شیریں ہو سخن

بچپنے میں ہم نے چوسی ہے زبانِ لکھنؤ

گلشنِ فردوس پر کیا ناز ہے رضواں تجھے

پوچھ اس کے دل سے جو ہے رتبہ دانِ لکھنؤ

بوئے اُنس آتی ہے حیدرؔ خاکِ مٹیا برج سے

جمع ہیں اک جا وطن آوارگانِ لکھنؤ

16 ۱۳۹

فغاں از آہ و زاری دلِ دیوانہ در پہلو
شب مازندہ می دارد ہمیں افسانہ در پہلو
دلِ من سوخت ناگاہ پرتوے از شمع رخسارش
فغاں کیں شعلہ افتادہ است بیباکانہ در پہلو
خوشم آید ز ساغر خندۂ سرشار بر دیم
خوشم آید ز مینا گریہ مستانہ در پہلو
ز فورِ مستی من کرد برہم وضع محفل را
در آغوش است ساقی شیشہ و پیمانہ در پہلو
نمی دانم چہ افسوں کرد بر من نشۂ ہستی
نگاہم محو غیر و جلوۂ جانانہ در پہلو
خوشا عرفاں اگر از ما سوا پہلو تہی کردی
ببیں کز گنج خالی نیست ایں ویرانہ در پہلو
زدم بر شمع بالیں آستینے در شبِ ہجراں
دلم می سوخت بر بے تابی پروانہ در پہلو
بشمع قامت آں ترک حسن فتنہ زا باشد

که خود تیغش بلرزد چوں پر پروانه در پہلو
تنم را زار کردست آنچناں سودائے زلف او
نمایاں استخواں ها گشته مثل شانه در پہلو
بشر در انقلاب دہر گوئی در غلطاں است
بہر پہلو که غلطد دارد آب و دانه در پہلو
همانا چاره داغ دل از مرہم نمی آید
که دارم سینه بر پہلو و آتش خانه در پہلو
مثل شد در تناسب چشم و ابرویش چو در عالم
ز راهِ شوق مسجد می کشد میخانه در پہلو
دلم محوِ طلسماتِ جہاں من طالب صانع
ہوائے کعبه در سر دارم و بتخانه در پہلو
خوشا وقتِ قدح خواری که گردش میکند باہم
بنزمش ساغر و ہم سبحه صد دانه در پہلو
چه طومار شکایتها که بنوشتم باو آخر
که ہر یک نقطه دارد معنی بیگانه در پہلو
چو گل با خار بینی جائے فریاد است اے حیدر
که دل سوزد لبش پر خنده و بیگانه در پہلو

۱۴۹ حرف ہ ۱۳

کس لئے پھرتے ہیں یہ شمس و قمر دونوں ساتھ / کس کو یہ ڈھونڈتے ہیں برہنہ سر دونوں ساتھ

کیسی یارب یہ ہوا صبح شب وصل چلی / بجھ گیا دل مرا اور شمع سحر دونوں ساتھ

بعد میرے نہ رہا عشق کی منزل کا نشاں / مٹ گئے راہبر و راہ گذر دونوں ساتھ

اے جنوں دیکھ اوسی صحرا میں اکیلا ہوں میں / رہتے جس دشت میں ہیں خوف و خطر دونوں ساتھ

مجھ کو حیرت ہے شب عیش کی کوتاہی پر / یا خدا آئے تھے کیا شام و سحر دونوں ساتھ

اس نے پھیری نگہ ناز یہ معلوم ہوا / کھنچ گیا سینے سے تیر اور جگر دونوں ساتھ

غم کو دی دل نے جگہ دل کو جگہ پہلو نے / ایک گوشے میں کریں گے یہ بسر دونوں ساتھ

اس کو روکوں میں الٰہی کہ سنبھالوں اس کو / کہ تڑپنے لگے دل اور جگر دونوں ساتھ

ناز بڑھتا گیا بڑھتے گئے جوں جوں گیسو / بل کی لینے لگے اب زلف و کمر دونوں ساتھ

تجھ سے مطلب ہے نہیں دنیا[1] و عقبیٰ سے غرض / تو نہیں جب تو اجڑ جائیں یہ گھر دونوں ساتھ

بات سننا نہ کسی چاہنے والے کی کبھی / کان میں پھونک رہے ہیں یہ گہر دونوں ساتھ

آندھیاں آہ کی بھی اشک کا سیلاب بھی ہے / دیتے ہیں دل کی خرابی کی خبر دونوں ساتھ

کیا کہوں زہرہ و خورشید کا عالم اے نظم
نکلے خلوت سے جو نہیں وقت سحر دونوں ساتھ

---

[1] دنیا میں الف مقصورہ ہے لہذا اس کا متحرک کر لینا جائز ہے

۱۴۱ — ۱۱

یوں تو نہ تری جسم نہ ہیں زنہار ہاتھ
دینے کے اے کریم مگر ہیں ہزار ہاتھ

انگڑائیوں میں پھیلتے ہیں بار بار ہاتھ
شیشہ کی سمت بڑھتے ہیں بے اختیار ہاتھ

ڈوبے ہیں ترکِ سعی سے افسوس تو یہ ہے
ساحل تھا ہاتھ بھر پہ لگاتے جو چار ہاتھ

آتی ہے جب نسیم تو کہتی ہے موجِ بحر
یوں آبرو سمیٹ اگر ہوں ہزار ہاتھ

دیتے ہیں میرے قتل کے احباب اور میں
خوش ہوں کہ میرے خون میں رنگتے ہیں یار ہاتھ

دامن کشاں چلی ہے بدن سے نکل کے روح
کھنچتے ہیں پھیلتے ہیں جو یوں بار بار ہاتھ

مٹتا نہیں نوشتۂ قسمت کسی طرح
تھکے ہیں سر کو پھوڑ کے زانو پہ مار ہاتھ

ساقی سنبھالنا کہ ہے لبریز جامِ مے
لغزش ہے میرے پاؤں میں اور رعشہ دار ہاتھ

مطرب سے پوچھ مسئلۂ جبر و اختیار
کیا تال سم پہ اٹھتے ہیں بے اختیار ہاتھ

میں اور ہوں علائقِ دنیا کے دام میں
میرا نہ ایک ہاتھ نہ اس کے ہزار ہاتھ

اے نظمؔ وصل میں بھی رہا تو نہ چین سے
دل کو ہوا قرار تو ہے بے قرار ہاتھ

حرف ی

مفاعیل فاعلات مفاعیل فاعلات

۱۴۲ — ۱۰

جھگڑا پڑا ہوا ہے نکلنے میں جان کے
کچھ حوصلے ابھی ہیں ابھی امتحان کے

آئی بہار اور خفقانی جہان کے
جنگل میں ہیر بن کے گئے خاک چھان کے

لا یعقلانہ طرز ہیں سارے جہان کے
کیسی شراب دور میں ہے آسمان کے

کیا دیر انقلاب میں اب ہے جہان کے
تارے پہنچ گئے ہیں قریب آسمان کے

دکھلا دو منہ ذرا صف محشر میں آن کے
اوڑ جائیں ہوش آج بھی سارے جہان کے

چاہے تو دو جہاں کو ڈبو دے یہ طفل اشک
مٹھی میں ہیں یہ سات ورق آسمان کے

حیران ہوں گلہ جو کسی سے کروں تو کیا
جو دل کا حال ہے نہیں قابل بیان کے

یاں تک پہنچ گئے تو حلقہائے زلف
قلابے مل گئے ہیں زمیں آسمان کے

ہے مغتنم کہ ہجر میں رونا ہی آگیا
آنکھوں پہ لوں گا میں قدم اس میہمان کے

سمجھا چھوڑا لگا تھا میں دل سے اٹھا کے ہاتھ
دل ہاتھ دھو کے پیچھے پڑا میری جان کے

گوندا یہ کہہ رہا ہے کہ ہے فوج گل قریب
کہسار تک پہنچ گئے ہاتھی نشان کے

شیریں ہیں تیری گالیاں بھی حرف تلخ
اوصاف کس زبان سے ہوں اس زبان کے

پایا تجھے نہ عالم اجسام میں کہیں
چھان آئی فکر سات طبق آسمان کے

اب تک میں سن رہا ہوں صدائے الست کو
گویا حجاب قدس ہیں پردے ہیں کان کے

احسان سر پہ لے تو کسی با وقار کا
ٹھہرے اگر تو سایہ میں اونچے مکان کے

آنکھوں کے سامنے سے گیا ہے وہ قافلہ
دیکھے جہاں ہیں لوگ نہ اس آن بان کے

بہتر ہے تو بھی اے نفس واپسیں نہ آ
کتنک اوٹھاؤں ضعف میں صدمے تکان کے

سوجھی میں چشم غول کو سمجھا چراغ بام
مارا پڑا ہوں یہاں ہیں تیر مگان کے

اے دود آہ ہو گئی رسوائیوں کی حد
جھنڈی پہ چڑھ گئی ہے یہ ہاتھی نشان کے

اے نظم بزم عیش یہ تقلید کا ہے گماں
چھریاں یہ چل رہی ہیں کہ فقرے اذان کے

۱۴۳ ۲۱

روکے ہوئے ہے بن کے حصار آسماں مجھے
ذوق وصال کھینچ کے لایا کہاں مجھے

لے تو چلا ہے توسن عمر رواں مجھے
اس کی خبر نہیں کہ گرا دے کہاں مجھے

ہوش و خرد ملے مجھے تاب و تواں مجھے
اس کے عوض اٹھانا ہے بار گراں مجھے

ہوں قلزم فنا میں سہارے یہ سانس کے
دیکھ اے حباب خوب ملا بادباں مجھے

جب سے کنارہ میں نے کیا سرو کی طرح
یکساں ہے اس چمن کی بہار و خزاں مجھے

کچھ کہہ رہی تھی شہر خموشاں کی خامشی
کوئی سنے تو یاد ہے اک داستاں مجھے

جلدی نہ کر تعلق دنیا ہے سدّ راہ
اے موت توڑنا ہے یہ بند گراں مجھے

اچھا اگر نہیں شنوائی نہیں سہی
اس کا علاج کیا کہ ہے ذوق فغاں مجھے

کھنچتا ہے اور اٹھتے بیٹھتے واماندوں کا غبار
کیوں ٹھوکروں میں لے نہ گیا کارواں مجھے

خود کو سنبھالتا کہ میں دل کو سنبھالتا
اک بیخودی تھی ہوش تھا یارب کہاں مجھے

دیکھا شعار اہل ورع سمعہ و ریا
آئی پسند صحبت دیر مغاں مجھے

سن لے یہ کہہ رہا ہے زمانہ شباب کا
وقت عزیز میں ہوں نہ کر رائگاں مجھے

بھولا ہوا ہوں عہد کو صبح الست کے
پہلا سبق ہوا نہیں اب تک رواں مجھے

ناوک لگا رہا ہے اس انداز سے کوئی
لہرا رہی ہے موجِ ترنگ کماں مجھے

سر میں سفیدی آ گئی پایا نہ پھر بھی ہوش
پچھلے کی چاندنی ہیں یہ خوابِ گراں مجھے

کچھ کم نہ تھا بہار کا غم اس پہ یہ ستم
رہ رہ کے چھیڑ جاتی ہے بادِ خزاں مجھے

آفاتِ دہر سے تھا ہراساں میں کس قدر
دی مرگِ ناگہاں نے نویدِ اماں مجھے

رحمت بغیر خلق میں راحت نہیں نصیب
تنکے چنے میں جب تو ملا آشیاں مجھے

خواہش کی پیروی ہے جہنم کا سامنا
گلخن نما میں سلسلۂ تجلی ہوس گلستاں مجھے

باہم جو اتحاد ہے پاتا نہیں رقیب
اس کے وہاں او سنے تو میری ہماں مجھے

اے نظمؔ کوہ و دشت میں ٹکرا رہا ہوں اب
بانگِ جرس ہوں چھوڑ چلا کارواں مجھے

۱۴۲ ۲۲

گذری نسیم باغ کو شاداں کیے ہوئے
رہ جاتے ہیں جہان میں احساں کیے ہوئے

رخ ہے عدم کا عمرِ گریزاں کیے ہوئے
ہستی کو گردِ جنبشِ داماں کیے ہوئے

تھی صبح ظلمتِ شبِ غم سے ڈری ہوئی
آئی چراغ کو تہِ داماں کیے ہوئے

کیا جلد جا رہا ہے زمانہ نشاط کا
اسپِ عناں گسستہ کو جولاں کیے ہوئے

آیا تھا جوشِ لالہ و گل کی طرح شباب
جاتا ہے خونِ حسرت و ارماں کیے ہوئے

دشمن سے رنج پہنچے تھے وہ سب بھلا دیے
بھولا نہیں ہیں دوست کے احساں کیے ہوئے

میدانِ بازپرس میں دیوانگانِ عشق
بیٹھے ہیں جا کے فرقِ عصیاں کیے ہوئے

دو چار اشک نذر کو لایا ہوں اے کریم
جو خونِ آرزو میں ہیں غلطاں کیے ہوئے

شبنم اوڑی ہے پھونک کے افسونِ اثر
تسخیر آفتاب کا ساماں کیے ہوئے

ہم آپ سب شریک تھے بزمِ الست میں
کچھ یاد بھی ہیں وعدہ و پیماں کیے ہوئے

آزادہ مشربی کا جنہیں کچھ نہیں خیال
یہ لوگ زندگی کو ہے زنداں کیے ہوئے

بیباکیوں پہ فخر ہے سفاکیوں پہ ناز
منہ دیکھتے میں تیغ کو عریاں کیے ہوئے

قامت میں اس کے اور قیامت میں فرق کیا
مصرع میں دونوں دست و گریباں کیے ہوئے

یارانِ رفتہ سوتے ہیں کس کنجِ تار میں
بزمِ نشاط و عیش کو ویراں کیے ہوئے

راہِ طلب میں بیچ کے ہوا و ہوس چلے
ہاں سرکشوں کو تابعِ فرماں کیے ہوئے

پیری نے دی شکست نگہ نے دیا جواب
جاتی ہے بیرخی صفِ مژگاں کیے ہوئے

امید و یاس کرتی ہے طاؤس کا سنگار
رنگِ پریدہ کو چمنستاں کیے ہوئے

ساقی نوید و مژدہ کہ آئی ہے فصلِ گل
بدلی میں آفتاب کو پنہاں کیے ہوئے

نکلی چمن میں یہ فال کہ حل مشکلیں ہیں سب
چٹکی کلی کہ عقدے ہیں آساں کیے ہوئے

کیا دامنِ نسیم میں ہے جانفزا ہوا
غنچے تھے نہیں چراغ فروزاں کیے ہوئے

موجِ شمیم تہ میں شگوفوں کی ہے نہاں
بالِ پری کا رنگ نمایاں کیے ہوئے

اک لالہ زار خونِ سرِ کوہکن کا ہے
دامن میں میتوں کے چراغاں کیے ہوئے

اے نظم شاعری نہ رہی ساحری تو ہے
ہیں اس کا اعتراف سخنداں کیے ہوئے

او تنا ہی شکر نعمت و راحت میں چاہیے
جتنی شراب محفل عشرت میں چاہیے
اس بات کا خیال محبت میں چاہیے
برگ حنا دو رنگ ہے اس سے ہی پائے مال
میکش ہو رند مست ہو شاہد پرست ہو
نکلا حریم قدس رگ جاں کے متصل
پہلو سے دل نکال کے ہاتھوں پہ اپنے رکھ
خدمت کا عمر بھر کی صلا اے متاع دہر
اے اضطراب تنگ لحد کو تو یوں ہلا
ہستی کے ساتھ روگ ہیں لاکھوں لگے ہوئے
حسرت سہی امید سہی آرزو سہی
اہل وطن نہیں سہی یاد وطن سہی
آنکھوں میں پڑ کے کھٹی ہے یہ خاک تو کہاں
اپنی ہی جب نظر میں سماتے نہیں ہیں ہم
احباب پر نہ لاش اٹھانے کا بار ہو
طعنے دئے تو گالیاں دینی ہیں شرم کیا

جتنا کہ صبر رنج و مصیبت میں چاہیے
اوتنا ہی خون دل غم فرقت میں چاہیے
یعنی جو چاہیے تو حقیقت میں چاہیے
بس ایک رنگ معنی و صورت میں چاہیے
ہاں سمعہ و ریا نہ عبادت میں چاہیے
ایسی طناب پردۂ قدرت میں چاہیے
ایسا حضور قلب عبادت میں چاہیے
کیا دو گی گز کفن مجھے خلعت میں چاہیے
کچھ فرق گاہوارہ و تربت میں چاہیے
جو چاہیے نہیں وہ اس آفت میں چاہیے
مونس کوئی تو عالم وحشت میں چاہیے
کوئی تو ساتھ وادی غربت میں چاہیے
سرمہ ضرور دیدۂ عبرت میں چاہیے
اب کون سی ہے بات جو ذلت میں چاہیے
میری لحد بھی گوشۂ عزلت میں چاہیے
کچھ تو بھلا نمک بھی جراحت میں چاہیے

یوسف اگرچہ دل ہے مرے دو نگاہ غفت ہی — انکار اور آپ سے قیمت میں چاہیے

منزل جو ہے پہاڑ تو اے نظم غم نہ کر
تیزی قدم کی قطع مسافت میں چاہیے

١٤٥ — ١٠

پہلو میں دل ہے آرزوئے یار کے لئے — آنکھیں ملی ہیں حسرت دیدار کے لئے

طاعت پہ تجھ کو ناز ہے رحمت پہ مجھ کو ناز — زاہد یہ حسن بحث ہے بیکار کے لئے

سوئے ہیں تن کھڑے ہیں قیامت کے خوف سے — شاید ہے بال بال گنہ گار کے لئے

کانٹوں نے پیرہن کو تبرک بنا لیا — ایک ایک تار لے لیا دستار کے لئے

اب کے عجب نہیں ہے ہوئے بہار سے — اوترے ہیں مسیح نرگس بیمار کے لئے

دیکھا نگاہ بھر کے جو آنکھوں نے یار کو — دو جام بھر کے شربت دیدار کے لئے

لالچ ہے مال و زر کا بری طرح کام میں — دیتے ہیں جان شربت دینار کے لئے

پہلو میں ان دنوں ہے غم و یاس کا ہجوم — دل کے لئے جگہ ہے نہ دلدار کے لئے

یاد آتی ہے ہوا تری کوچہ کی خلد میں — دل لوٹتا ہے سایہ دیوار کے لئے

حیدر کو سلسلہ تھا نہ ان گیسوؤں سے کچھ
لیکن الجھ پڑے ہیں وہ بیکار کے لئے

١٤٦ — ١١

اعمال کے سبب سے گراں بار ہو گئے — جو مرحلے تھے سہل وہ دشوار ہو گئے

میکش کے حق میں زہر ہے تمیز نیک و بد
رحمت خدا کی ان کو جو سرشار ہو گئے

بسمل دل و جگر کو نہ دیکھا تھا اس طرح
نالے تو آج کھنچتے ہی تلوار ہو گئے

قہر و عتاب کی بھی نگاہیں تھیں دلنشیں
پیوست تیر تا لب سوفار ہو گئے

اس رہ گذر میں دام نہاں زیر دام تھا
آزاد بھی ہوئے ہی تھے کہ گرفتار ہو گئے

بجلی کی طرح کرتے ہیں راہِ صراط طے
اس پار ہی تھے پر کے ہم اوس پار ہو گئے

دانتوں کے ساتھ دیکھے مہ پارے بھی ٹوٹتے
جو دن تھے زندگی کے شب تار ہو گئے

مومن اٹھے کتنے رہ گئے بتکدے میں سبھی
کافر اسیر حلقۂ زنار ہو گئے

عبرت سے دیکھ گور غریباں کے ڈھیر کو
کتنے ہی قصر تن تھے جو مسمار ہو گئے

ساقی کی چشم مست کا رندوں سے حال پوچھ
ملتے ہی آنکھ واقف اسرار ہو گئے

مرنے کی آرزو ہی شب غم میں رہ گئی
حیلے جو موت کے تھے وہ بیکار ہو گئے

مرکز کی طرح جب کوئی ثابت قدم رہا
اپنے نصیب کے خط پرکار ہو گئے

بدخوابیوں میں ظلمت شب غم کٹ گئی
غافل کبھی رہے کبھی ہشیار ہو گئے

۱۸۷

آخر ہوا شباب وہ صحبت نہیں رہی
لو صبح ہو گئی شب عشرت نہیں رہی

پچھلے کی چاندنی ہیں یہ سر کے سفید بال
جاڑوں کی دھوپ میں وہ حرارت نہیں رہی

سیماب کشتہ ہو گیا کافور شیب سے
بیچین دل وہ شوخ طبیعت نہیں رہی

سکتہ میں بھی نہ آئینہ دکھلائیں چارہ گر — اب کوئی منہ دکھانے کی صورت نہیں رہی
دلکو سنبھالے رہتی تھی پہلے ہمیں اور اب — خود کو سنبھالنے کی بھی طاقت نہیں رہی
مانند ابر گو کہ سراپا بخار ہیں — مانند برق نبض میں سرعت نہیں رہی
تلووں کو شوق خارِ مغیلاں نہیں رہا — سر میں ہوائے وادیٔ وحشت نہیں رہی
وہ انتظارِ وصل کی شب کا گذر گیا — وہ بیقراریٔ شبِ فرقت نہیں رہی
ماتم ہی ہم شباب کا کرتے تمام عمر — مجبور ہیں کہ ہاتھ میں طاقت نہیں رہی
ہے کچھ دنوں کا ذکر کہ جینے کی تھی بہار — لیکن اب اس چمن میں طراوت نہیں رہی
ہے کچھ دنوں کا ذکر کہ شیریں بہت تھی زیست — لیکن اب اس شکر میں حلاوت نہیں رہی
ہے کچھ دنوں کا ذکر کہ تھی رخ پر آب و تاب — لیکن اب آئینہ میں وہ طلعت نہیں رہی
گفتار میں مزہ ہے نہ رفتار میں ادا — باقی وہ بول چال میں لذت نہیں رہی
اب یہ فروتنی یہ تواضع یہ انکسار — وہ نخوتیں وہ شان وہ شوکت نہیں رہی
لبریز ہو چکا ہے جو پیمانہ عمر کا — جامِ شرابِ ناب پہ رغبت نہیں رہی
جاتا رہا شباب رہا غم شباب کا — باقی رہا عذاب قیامت نہیں رہی
بالیں پہ آکے ناز سے کہتی ہے یہ اجل — کیوں اب تو سچ کہو کوئی حسرت نہیں رہی
بولی یہ روح قالبِ خاکی کو چھوڑ کر — دامن پہ گرد وادیٔ غربت نہیں رہی
ان ابروؤں سے راہ حقیقت ملی مجھے — اب دو کمان کی مسافت نہیں رہی
خلوت جو چاہتا ہے تو حیدر خودی کو چھوڑ — خلوت میں ما و من ہو تو خلوت نہیں رہی

۱۴۸

میں دیکھتا ہی رہ گیا وہ چال چل گئے
حسرت سے دیکھنے پہ وہ کیسا بدل گئے
ناوک بھی تیر کرتے ہیں بے اعتنائیاں
یکساں ہے اب نشیب و فراز جہاں ہمیں
منزل کا شوق اپنے لئے خضر راہ تھا
سیل فنا میں دونوں کی دونوں تھے بے ثبات
پیدا ہے صدہا برگ درختان سبز سے
ہے کارساز گریۂ اضطراب برق
حیران ہوں کہ ڈھونڈ کے لاؤں کہاں سے آب
عالم کو پھر سرا نہ کہیں ہم تو کیا کہیں
کہتی رہیں مہر و ماہ کی جلوہ فروشیاں
تاروں تو سرتیں گنج گراں مایہ لے گیا
بے دیکھے آگیا ارنی گو کو غش یہ غش
ہم دل جلوں کے حال کا پروانہ ہو گواہ
نادان ہیں جنکو قالب خاکی عزیز ہے
ناظم بھی شب کو بزم میں زاہدوں کی تھا شریک
میدان امتحان میں تجھے کتنے ہی بلہوس

۳۴

پہلو سے دل نکال کے تلووں سے مل گئے
آخر نہ قتل کر کے بھی تیوری سے بل گئے
آئے ادھر سے اور ادھر سے نکل گئے
جاتا رہا شباب تو سانچہ میں ڈھل گئے
تھک تھک کے لاکھ بار گرے پھر سنبھل گئے
آ کر حباب چشم سے ٹوپی بدل گئے
آئے یہاں سب اور کف افسوس مل گئے
تڑپا جو دل تو آنکھ سے دریا ابل گئے
جو ولولے شباب کے دل سے نکل گئے
آنا ہے یہ بھی کوئی کہ آج آئے کل گئے
کھوٹے درم بھی عالم فانی میں چل گئے
ایسے بھی لوگ گذرے ہیں جو سر کے بل گئے
آئے وہ اور آنکھ بچا کر نکل گئے
پہنچے قریب اسقدر اور ہوئے کہ جل گئے
مٹی کا مل گیا جو کھلونا بہل گئے
کیا ٹوپیوں کا ذکر عمامے اچھل گئے
ٹھہرا گیا نہ زد پہ وہ آ کر نکل گئے

کیا خوف کا تبانِ عمل کا بہار میں
ساقی وہ رت بدل گئی پیمانے بدل گئے

جب دل پہ رکھ لیا نہ رکیں گے کسی طرح
پتھر کوہسار سامنے آئے تو ٹل گئے

رہتے تھے جو سدیر و خورنق سے قصر میں
لے کر لحد میں ساتھ نہ اونچے محل گئے

عمریں جنہوں نے گوشۂ عزلت میں کاٹ دیں
بیٹھے ہی بیٹھے وہ تو بڑی چال چل گئے

کس نے یہ کہہ دیا مرے ماتم میں رو دیے
نرگس کے پھول دشت لگا کر نکل گئے

قتل ہے اہلِ دید کا کافر کے زیرِ بام
دیکھی جو اک جھلک تو کلیجے مسل گئے

اے نظم عشق اور ہوس میں یہ فرق ہے
بیمار میرے ساتھ کے اکثر سنبھل گئے

۱۴۹ —— ۱۷

دل اس کے سامنے ہی وہ ہر دل کے سامنے
پردہ جو ہے تو آنکھ کے اک تل کے سامنے

بیٹھے ہیں ہم حسینوں کی محفل کے سامنے
کوئی تو آئے کاوشِ دل کے سامنے

ٹھہرا جنازہ گور کی منزل کے سامنے
کشتی بس اب پہنچ گئی ساحل کے سامنے

ہو گی مجھی پہ تیغ لگانے کی ابتدا
پہلے پہل چلا ہوں میں قاتل کے سامنے

اچھے رہے وہ راہِ وفا میں جو مر مٹے
پھیلائے پاؤں سوتے ہیں منزل کے سامنے

غنچہ کا دل بھی آہ سے خالی نہ تھا مگر
سنتا ہے کون شورِ عنادل کے سامنے

تیغِ نگاہ ایک خریدار سیکڑوں
چھریاں چلیں گی دیکھنا قاتل کے سامنے

ہم خاک ہو کے بھی نہ رکے راہِ شوق میں
آ پہنچے اٹھتے بیٹھتے منزل کے سامنے

دیکھا رگِ سحاب میں بجلی کا اضطراب
اک نبض ناتواں تپشِ دل کے سامنے

شرطِ وفا کا پاس رہے کشتگانِ عشق
تیوری چڑھی ہے نہ خنجر قاتل کے سامنے

قبلہ کے رخ گیا ہے لبوں تک پہنچ کے دم
الٹی چلی نہ سانس بھی منزل کے سامنے

کیسی نگاہ یاس نے تصویر کھینچ لی
قاتل کا منہ اتر گیا بسمل کے سامنے

بھولے ہوئے کو یاد دلانے سے فائدہ
کیوں دل کا نام لیتے ہو بیدل کے سامنے

اے ساربان ناقہ سلمیٰ ہوش باش
اڑ اڑ کے خاک آتی ہے محمل کے سامنے

میری سنی ابھی یہ جو نکلوا دیا مجھے
گستاخیاں بھری ہوئی محفل کے سامنے

ابرو کا حسن دیکھتے ہی چھپ گیا ہلال
ٹھہرا گیا نہ بدر مقابل کے سامنے

اے نظم مجھ سے پوچھ دلِ قیس کی خبر
دیکھا تھا لوٹتے کسی محمل کے سامنے

١٥٠ ٢۴

نشہ میں سوجھتی ہے مجھے دور دور کی
ندی وہ سامنے ہے شرابِ طہور کی

خدمت ہی تر زبانی گلشن طیور کی
ازبر ہیں عندلیب کو سطریں زبور کی

ہنگامِ وعظ عشوہ گری بے سبب نہیں
واعظ ترے خیال میں سلیقہ حتوں ہے حور کی

ان زاہدانِ خشک کو حصہ اگر ملا
مٹی ہوئی خراب شرابِ طہور کی

میدانِ حشر میں مرے نالوں کے سامنے
بیٹھی ہوئی نکلتی ہے آواز صور کی

تکیہ ہوا یہ مثلِ سلیماں ہوا تو کیا
ہلکے و روزہ چھا دیے ہاں طیور کی

جاؤں گا مدرسہ میں نہ میں خانقاہ سے ۔ رستے وہ سب ہیں بھیڑ کے راہیں ہیں دور کی
پائی ہے تیری دیکھنے والے نے وہ نگاہ ۔ جھپکی ذرا نہ آنکھ تجلی سے طور کی
اوٹھے اگر تو سیکڑوں فتنے اوٹھا کے آپ ۔ بیٹھے اگر کہیں تو شرارت ضرور کی
پڑھنے سے میرے خط کے بھی اوسکو حجاب ہے ۔ آنکھیں کھلی ہوئی ہیں جو بین السطور کی
کشتی مری بندھی ہوئی پانی میں ہے رواں ۔ گرداب غم کی فکر نہ موج سرور کی
سجدہ بھلا بتوں کو میں کرتا محال تھا ۔ تصویر ہے کھچی ہوئی تیری غرور کی
ہمت سے اہل جذب کی قائم ہیں آسماں ۔ اس خیمۂ سیہ میں طنابیں ہیں نور کی
ساقی لگا دے کشتیِ بادہ کنارِ آب ۔ دریائے غم سے فکر مجھے ہے عبور کی
سردی سے ہم فقیروں نے مرنا کیا قبول ۔ لیکن نہ کھال کھینچ کے پہنی سمور کی
فاقے گذر رہے ہیں جو اک پیرزال پر ۔ طوفان نوح کیوں نہ خبر لے تنور کی
لو اس کے سامنے بھی ہیں تابانیاں یہی ۔ نکلے گی آج لاش دلِ ناصبور کی
سمجھا ہیں آئینے سے جو ہوتی ہیں مشورے ۔ بیٹھے ہوئے بنائیے باتیں فتور کی
خوں کر دیا ہے فندقِ رنگیں نے لعل کو ۔ ساعد نے بھر دی رنگ گلابی بلور کی
گلشن کو دیکھتا ہوں میں نرگس کی آنکھ سے ۔ سنتا ہوں گوشِ گل سے کہانی طیور کی
سمجھ کو یہ آسماں کی دورنگی سے ہے تعجب ۔ دن آ رہے ہیں عیش کے راتیں ہیں سور کی
ایمانِ پیر میکدہ کی نظر پر جو چڑھ گیا ۔ چوٹی دکھائی دینے لگی کوہ طور کی
اس سال کربلا کی جو رخصت ملی مجھے ۔ حج کا ثواب نذر کروں گا حضور کی

اے نظم دیکھ لیجئے گا ہم جو کہتے ہیں
پھر اُس سے بات آپ کی اور رضر کی

١٩ — ١۵١

دل میں شرارت اوسکی سمائی ہوئی سی ہے
کچھ آگ دشمنوں کی لگائی ہوئی سی ہے

صورت عتاب کی یہ بنائی ہوئی سی ہے
او حیلہ جو ہنسی تجھے آئی ہوئی سی ہے

بادِ صبا یہ چال اوڑائی ہوئی سی ہے
ساری ادا کسی کی سکھائی ہوئی سی ہے

ہستی کا شور تو ہے مگر اعتبار کیا
جھوٹی خبر کسی کی اوڑائی ہوئی سی ہے

میں کس طرح فلک کے ستم کا گلہ کروں
یہ چال تو کسی کی سکھائی ہوئی سی ہے

شاہان سرفراز کا اتنا تو ہے نشان
کچھ گرد آسمان پہ چھائی ہوئی سی ہے

دلکش کچھ اس طرح کی صدائے الست تھی
کانوں میں آج تک جو سمائی ہوئی سی ہے

منزل اوسے سمجھ کے ٹھہرتے ہیں ہم
بستی جو رہزنوں کی بسائی ہوئی سی ہے

پہلے تو اضطراب تھا دل کو اس قدر
بجلی یہ آسماں کی گرائی ہوئی سی ہے

رنگیں ہے میری قتل سے دامن بھی یار کا
تلوار بھی لہو میں نہائی ہوئی سی ہے

پانی نہ مانگا کشتۂ شمشیر ناز نے
افعی کے زہر میں یہ بجھائی ہوئی سی ہے

آمد ہے ظلمتِ شبِ ہجراں کی دن سے آج
تاریکی آفتاب پہ چھائی ہوئی سی ہے

جلسہ تو ہوگا عید میں دورِ شراب کا
سرخی ابھی سے چہرہ پہ چھائی ہوئی سی ہے

اس بت کی دید کو نظر پاک ہیں ہے شرط
ور آنکھ آئینہ کی لگائی ہوئی سی ہے

نالے اُسی طرف ہیں رواں آہ اُسی طرف
جانِ حزیں فلک کی ستائی ہوئی سی ہے

زلفیں بھی حلقہ حلقہ ہیں کاکل بھی پیچ پیچ
آنکھوں میں وہ یہ دل میں سمائی ہوئی سی ہے

فصلِ بہار آ گئی اک جام پیجیے ہی
ساقی گھٹا بھی آنکھوں میں چھائی ہوئی سی ہے

سمجھو اسے ہنر ہو نہ شاعر کا ہی کلام
جس شعر میں کہ بات بنائی ہوئی سی ہے

آساں ہے نظمِ ترکِ ملاقات خلق سے
لیکن بری یہ دل میں سمائی ہوئی سی ہے

١٥٢ — ١٠

تنہا نہیں ہوں گر دلِ دیوانہ ساتھ ہے
وہ ہرزہ گرد ہوں کہ پریخانہ ساتھ ہے

ہنگامہ اک پری کی سواری کا دیکھنا
کیا دھوم ہے کہ سیکڑوں دیوانہ ساتھ ہے

دل میں ہیں لاکھ طرح کے حیلے بھرے ہوئے
پھر مشورہ کو آئینہ و شانہ ساتھ ہے

روزِ سیہ میں ساتھ کوئی دے تو جانیے
جب تک فروغِ شمع ہے پروانہ ساتھ ہے

دنیا نہیں ہے ساتھ تہی دست کا کوئی
جب تک کہ مے ہے شیشہ میں پیمانہ ساتھ ہے

سیکھا ہوں بتکدہ میں طریقِ فروتنی
جب تک کہ سر ہے سجدۂ شکرانہ ساتھ ہے

جو بے بصر ہیں ڈھونڈتے پھرتے ہیں دور دور
اور ہر قدم یہ جلوۂ جانانہ ساتھ ہے

کیا خوف ہو ہمیں زنِ دنیا کے مکر کا
اپنی مدد کو ہمتِ مردانہ ساتھ ہے

غم کی کتاب ہے دلِ صد پارہ کم نہیں
جس بزم میں گئے یہی افسانہ ساتھ ہے

مانندِ گردباد ہوں خانہ بدوش میں
صحرا میں ہوں مگر مرا کاشانہ ساتھ ہے

۱۵۳ ۱۵

باندھے تھے ان کے ہاتھ لگا کر حنا کبھی کھولے تھے چھیڑ چھیڑ کے بند قبا کبھی
فریاد و آہ سے نہ مرا دل بھرا کبھی فوراً اٹھا ہے درد جو میٹھا گلا کبھی
تھی ہم سے آپ سے نہ ملاقات کیا کبھی یوں پھر گئے کہ جیسے نہ تھے آشنا کبھی
عالم کو قتل کیجیے ترچھی نگاہ سے یہ ہے وہ تیر جو نہیں کرتا خطا کبھی
کعبہ سے بتکدہ میں گیا خیر ہو گئی زاہد یہاں قبول نہ ہوتی دعا کبھی
اب اشک گرم آتے ہیں ساتھ آہ سرد کے ایسی تھی بر خلاف نہ آب و ہوا کبھی
دیکھا تھا اک نظر کہ چلے سو نگہ کے تیر کہتا رہا کہ اب سے نہ ہو گی خطا کبھی
تھا اوس کی میری بیچ میں دریائے آئینہ اوس پار اس طرف کی نہ پہنچی صدا کبھی
گرداب میں جب آ گئی کشتی تو سمجھے ہم ساحل پہ یاد ہی نہیں آیا خدا کبھی
اس بزم میں جلائے گئے ہم شمع کی طرح نکلا زباں سے نہ برا یا بھلا کبھی
گویا کہ زخم تھا میں دلِ روزگار کا رویا کبھی تو حال پہ اپنے ہنسا کبھی
بے وجہ ہو کسی کی برائی میں جو کوئی اس کا کبھی اس جہاں میں نہ ہو گا بھلا کبھی
زانو پہ مار ہاتھ کہ پتھر سے پھوڑ سر مٹتا نہیں نصیب کا غافل لکھا کبھی
ظلمات میں تو جا کے نکل آئے تھے خضر کوچہ میں زلف کے نہ ملے گا پتا کبھی
چشمے کبھی بہائے ہیں اور گلا کبھی ہے زہر میرا قلم عصا تھا کبھی اژدہا کبھی

۱۵۲ ۷

کیا ظرف عاریت نفسِ مستعار ہے
جس کی بقا کا آمد و شد پر مدار ہے

چرخِ مکوکب ایک نمودِ شرار ہے
ہستی سے جو کہ تا بہ عدم بے قرار ہے

چھوڑے نہ راستی کا کبھی راستہ بشر
ہونے دے گر عدو فلکِ کج مدار ہے

پتھر میں گھر بنایا ہے تو نے جو اے شرار
آخر بنائے عمر بھی کچھ پائدار ہے

ہے یہ صدا شکست میں جامِ حباب کی
طرفہ طلسم یہ نفسِ مستعار ہے

ہونے کو اب ہے چاک گریباں کو آہ میں
انداز پر فشانیِ بادِ بہار ہے

فکرِ رسا کی ہیں قدر انداز یاں عجیب
جو طائرِ خیال ہے اس کا شکار ہے

۵۵ ۱۱

نظروں سے تو نہاں وہ مثالِ نظر رہے
آنکھوں میں پتلیوں کی طرح جلوہ گر رہے

ہے آنکھ وہ کہ عیب پہ اپنی نظر رہے
وہ ہے مژہ کہ اشکِ ندامت سے تر رہے

دو دن سرائے دہر میں آ کر اتر رہے
کہنے کو سب کہیں گے یہی عمر بھر رہے

کہتی ہے اے صبا یہی آہستگی کی چال
تو چاہتی ہے باغ میں دم بھر ٹھہر رہے

آیا نہ کچھ جواب تو قاصد پھرا کوئی
خط لے کے جو گئے تھے وہیں جا کے مر رہے

کیسا خیالِ ضبط نے رسوا کیا مجھے
نوکِ مژہ پہ اشک کے قطرے ٹھہر رہے

دم بھی روانہ ہو اگر افشائے راز ہو
بس کاروانِ آہ مرا ہم سفر رہے

پڑھ لو لکھا ہے صاف خطِ تیغِ یار میں
ہم معرکہ میں عشق کے سینہ سپر رہے

میں نے کبھی پڑھی جو دعائے ہلال بھی
ابرو کسی حسین کے مدِ نظر رہے

خورشید پر یہ خندہ دنداں نما ہوا | شبنم کے اشک گل پہ جو وقت سحر رہے

اے نظم ساتھ نبھ نہ سکا اہل ذوق کا
جب وہ قدم اٹھا کے چلے ہم ٹھہر رہے

١١ —————— ١٥٦

میں ہی رہا نہ اے شب عشرت نہ تو رہی
وقت سحر نہ بزم طرب رو برو رہی
سمجھے گے تم نہ بات نہ مانوں گا میں کبھی
خلوت میں آئینہ نے بھی دیکھا ترا جمال
جھگڑا تمام ہو گیا پہلی نگاہ میں
دل میں مرے ہوا و ہوس کی جگہ نہ تھی
حیرت سے اپنی درس خموشی ملا مجھے
عالم میں اے اجل نہ کوئی تھا رفیق بلد
نکلیگی تن سے روح خدا جانے کس طرح
بخشش کا حکم ہو گیا رحم اس کو آ گیا

رونے کو لاش پہ جو رہی آرزو رہی
اک میں گرفتہ دل رہا اک آرزو رہی
میرے تمہارے حشر پہ اب گفتگو رہی
او بیوفا رہی تو مجھے آرزو رہی
اچھا ہوا کہ جان گئی آبرو رہی
ناخواندہ میہماں کی طرح آرزو رہی
طوطی کو آئینہ سے اگر گفتگو رہی
میں تیرے ساتھ اور مرے ساتھ تو رہی
گر وقت نزع کشمکش آرزو رہی
جب تھوڑی دیر لاش مری قبلہ رو رہی

بیگانہ تھی یہ آمد و رفت نفس بھی نظم
ہر ایک ذی حیات کو کچھ جستجو رہی

١٥ —————— مفعول فاعلاتن دوبارہ —————— ١٥٧

خاموش ہیں فغاں سے لب آشنا نہیں ہے
اوس کارواں میں ہیں ہم جس میں درا نہیں ہے
کچھ آرزو نہیں ہے کچھ التجا نہیں ہے
پائے طلب نہیں ہے دستِ دعا نہیں ہے
بندہ ہے رندِ مشرب کچھ پارسا نہیں ہے
پھولوں میں بوریئے کے بوئے ریا نہیں ہے
پھینکی کمند کیونکر قمری کے آشیاں پر
سروِ چمن کا طرہ اتنا رسا نہیں ہے
ہے گلبنِ شگفتہ عہدِ شباب لیکن
رنگِ بقا نہیں ہے بوئے وفا نہیں ہے
نکلے جو میرے دل سے میری نہیں تمنّا
پیدا اثر ہو جس میں میری دعا نہیں ہے
کیوں تیری رہگذر میں بیمار سر نہ پٹکیں
تعویذِ دردِ سر ہے یہ نقشِ پا نہیں ہے
بلبل کو عشقِ گل میں کیا خاک لطف ہوگا
تیرِ نگہ نہیں ہے تیغِ ادا نہیں ہے
اہلِ دول نہ اتنے پھیلائیں پاؤں اپنے

یہ کارواں سرا ہے دولت سرا نہیں ہے

کیا جانے دردِ ہجراں کیا جانے آہِ سوزاں
ناصح مری طرح سے تو مبتلا نہیں ہے

یہ دل ودیعتِ حق اور معرفت سے خالی
آئینہ تو ہے لیکن اس میں جلا نہیں ہے

جاتی ہے غمزدوں کی فریاد اوپر اوپر
گنبد میں آسماں کے شاید صدا نہیں ہے

حیرت کا میری باعث جلوہ ہے خود تمہارا
تم آئینہ سے پوچھو میری خطا نہیں ہے

کہنے سے تیرے ناصح چھوڑوں میں ہرزہ گردی
تیری طرح سے میرا کچھ سر پھرا نہیں ہے

نظم آج ڈھونڈنے کو اس کے چلا تھا گھر سے
کھویا گیا خود ایسا جس کا پتا نہیں ہے

۱۵۸ مفاعلن فعلاتن مفاعلن فعلات ۱۲

بسانِ نکہتِ گل ساتھ ہم صبا کے چلے
ہے آشنا وہ جو کہنے یہ آشنا کے چلے

فضائے دہر میں ہم مثلِ برق آ کے چلے
تڑپ کے کاٹ دیا وقت مسکرا کے چلے

ردا روی میں یہاں ہم، سن لو قافلہ والو
کہ جس کو ساتھ ہو دنیا قدم اٹھا کے چلے

نمود عشق پیری ہوا اجل آئی
چراغ صبح تھے گویا کہ جھلملا کے چلے

نثار ہو جیے اس دل پہ ہو جو صاحب درد
وہ پاؤں چومیے جادہ پہ جو وفا کے چلے

یہ کیسا حسن کا نشہ یہ یوں چال ہے کیا
زبان بہک کے چلے پاؤں لڑکھڑا کے چلے

سنا ہے برق کو اک لاگ ہے بلندی سے
بشر نہ حد سے زیادہ بھی سر اٹھا کے چلے

خدا کے واسطے ای صبر و تاب و ہوش و خرد
کہاں چلے کہ مجھے بیڑیاں پنہا کے چلے

یہ دیکھتا ہوں کہ ہے دل کی تلاش اور میں ہوں
خبر نہیں ہے تجھے وار کب ادا کے چلے

کبھی جو آ گئے تکیہ پہ ہم فقیروں کے
دعائیں سن کے چلے کوسنے سنا کے چلے

نظارہ جس کا ہو عالم کو مایۂ حسرت
وہ راستہ میں نہ کیوں اپنا منہ چھپا کے چلے

جب اپنی آنکھ ہوئی بند سب کی آنکھ کھلی
جو گہری نیند میں تھے ان کو ہم جگا کے چلے

دھوئیں اڑا دے اے نظم تیری باتوں نے
رقیب جل کے اوٹھے پیچ و تاب کھا کے چلے

۱۵۹ — ۸

اگر تو آرزوی خدمت مغان داری
بیار از دل و دین انچه ارمغان داری

اگر درنگ و تامل کنی زیان بر تست
که صید بر هدف و تیر در کمان داری

زمانه در شفق خون هلال تیغ نو دید
تو آسمان دگر زیر آسمان داری

بتو قریب تر از تو حریم جانانست
ولیک نفس خودت را تو در میان داری

درین طلسم حوادث تو از چه افتادی
که منزل آن طرف دور آسمان داری

گدائے کوچۂ محبوب را ہمی زیبد
شکست طرف کلہ شوکت جہانداری

خضر بہ حالت تنہائیت دلم سوزد
چہ لطف زیست کہ اندوہ جاودانی داری

بنال نظم کہ ایں بزم میگساران نیست
شراب درد تو در شیشۂ فغاں داری

١٦٠ — ١٨

کتاں کی طرح جو نازک جگر نہیں رکھتے
وہ ذوقِ جلوۂ حسنِ قمر نہیں رکھتے

نہ دے سکیں گے مرا ساتھ رہروانِ طریق
وہ یوں قدم دمِ شمشیر پہ نہیں رکھتے

سفینہ اپنا ہی صبر و رضا کے ساحل پہ
امید و بیم کے طوفاں کا ڈر نہیں رکھتے

یہ راستی یہ تواضع جو سرو و بید میں ہے
شجر ہیں اور بھی ایسا ثمر نہیں رکھتے

مریضِ غم کو خوشی کیا جو ہے سحر نزدیک
کہ چارہ گر تو امیدِ سحر نہیں رکھتے

اوڑا دوی ای قدر افگن لگے تیر کوئی
ہوس ہے اوڑنے کی اور بال و پر نہیں رکھتے

وہ لوگ جو ہیں رہِ مستقیم کے سالک
قدم اودھر نہیں رکھتے اودھر نہیں رکھتے

فروتنی ہے کیا سرکشی کو یوں پامال
کہ جانتے ہیں کہ ہم تن پہ سر نہیں رکھتے

فلک نے وہ ہیں شبِ غم کے جاگنے والے
سوائے رنگِ پریدہ سحر نہیں رکھتے

عزیزِ خلق وہی خوش نصیب ہیں جو لوگ
سرِ غرور و دلِ کینہ ور نہیں رکھتے

ستارہ ریزیِ شامِ طرب میں محو ہیں جو
نفس گدازیِ بادِ سحر نہیں رکھتے

ہمیشہ لالہ کے مانند لب ہے پرخندہ
مگر شکایتِ داغِ جگر نہیں رکھتے

دماغ اپنا بھی ہے لامکاں پر لیکن
فلک کی طرح سے دورانِ سر نہیں رکھتے

گلوں کو بھی دل و دعویٰ ہے نغمہ سنجی کا
زبانِ حال کی بلبل خبر نہیں رکھتے

دکھاؤنگا اونھیں میں چاک چاک جیب شکیب
کہ زعم ہے نگہ پردہ در نہیں رکھتے

فغاں میں بلبل شیدا کے نشتر ہوں تو کیا
جو کوچۂ رگِ گل میں گذر نہیں رکھتے

فروغ بخش ہے چشمِ محبتِ احباب
شعاع مہر ہے تارِ نظر نہیں رکھتے

اونھیں کے حلقہ کا ناظم جرعہ نوش ہوں میں
خبر کچھ اپنی بھی جو بے خبر نہیں رکھتے

۱۶۱

جہان کس کا ہے عمر گریز پا کس کی
یہ چلتی چھاؤں ہے ہوتی ہے آشنا کس کی

نگاہ اس سے لڑی دل کا غیر حال ہوا
گناہ کس نے کیا آگئی قضا کس کی

وفور رشک سے محفل میں کہہ نہیں سکتا
لگا رہی ہے مجھے برچھیاں ادا کس کی

عدو ہے درپے جاں دوست درپے دل ہے
بیان کس سے کروں جا کے میں جفا کس کی

ٹپک پڑے ہیں جو مجنوں کے ذکر پر آنسو
یہ سچ بتا تجھے یاد آگئی وفا کس کی

مجھی پہ رکھتے ہیں الزام میرے ہی غمخوار
برا کہے اسے طاقت ہے یہ بھلا کس کی

کسی طرح نہیں جاتا خیال زلف و کمر
یہ کیا ہوا مرے پیچھے پڑی بلا کس کی

وہ آ کھڑا ہوا بالیں پہ اور میں اٹھ بیٹھا
کدھر کا ضعف کہاں کا مرض دوا کس کی

قدم پہ اس کے گرا سامنے ہی ناصح کے
لحاظ کیسا کہاں کا ادب حیا کس کی

ہوا تھا سایۂ دیوار میں گذر کس کے
اوڑالی تو نے سعادت پر ہما کس کی

سبک روی میں بھی غنچوں کے دل مسل ڈالے
یہ تیری چال میں شوخی ہے اے صبا کس کی

یہ کس حسین کی اترن ملی تجھے اے گل
ترے گلے میں ہے مسکی ہوئی قبا کس کی

یہ تیری عشوہ گری بے سبب نہیں نرگس
کھبی ہوئی تری آنکھوں میں ہے ادا کس کی

یہ تو ہے کیوں ہمہ تن گوش اے شگوفۂ باغ
یہ گونجتی ہے ترے کان میں صدا کس کی

چمن میں چھو تو دیکھا ہے شاخ گل تجھ کو
بلائیں لیں ترے ہاتھوں نے بارہا کس کی

یہ کس کے شوق میں اس کا جگر ہوا ہے لہو
یہ بے پسے ہوئے پامال ہے حنا کس کی

عبث ہے آپ کو تغییر حال کا رونا
جناب نظم رہی ایک سی سدا کس کی

١٦٣ ١٧

رقیب کہتے ہیں آوازے شر یہ کس کا ہے
میں چپ ہوں منہ مجھے وقت گریہ کس کا ہے

بتانے دیر میں واعظ یہ شب کو کیا گذری
کہ ایک شور تھا رندوں میں یہ کس کا ہے

نہ ساتھ لایا ہے کوئی نہ لے کے جائے گا
نہ بھول اس پہ ارے مال و زر یہ کس کا ہے

وہ زخم ہیں کہ مجھے دیکھ کے کہتی ہے وہ رخ
خدا کے واسطے دامان تر یہ کس کا ہے

جو دل جدا ہوا پہلو سے دل کا غم تو ہے
جو وہ نہیں نہ سہی شکر کر یہ کس کا ہے

ابھی نہ رو ابھی تو کیوں جذب شوق دیکھ لیا
یہ کس نے بات کی پھر منہ ادھر یہ کس کا ہے

جہاں ہوا ہے دگرگوں کسی کے جاتے ہی
کہ اپنے گھر کو یہ کہتا ہوں گھر یہ کس کا ہے

یہ کس کے دوست میں سر پہ ہوا اس سے پوچھتے ہیں — کہ داغ خون تری تلوار پر یہ کس کا ہے
بھڑکا کے غیر سے کیسا نکل گئے ہو نمود — یہ آگ کس کی لگائی ہے شر یہ کس کا ہے
لگاؤ تم اسے چھریاں کہ پائمال کرو — قسم تو ہم سے جو پوچھیں جگر یہ کس کا ہے
ادا کا وار بھی چل جائیگا خبر تھی کسے — یہ میں دیکھتا تھا کہ تیر نظر یہ کس کا ہے
بنایا سرمہ دنبالہ دار کو جو کمند — نگار آپ کو مد نظر یہ کس کا ہے
نہ منہ لگاؤ رقیبوں کو ہم نہ کہتے تھے — زباں بگڑ گئی دیکھو اثر یہ کس کا ہے
مرض سبہر کا ساری ہی بزم عیش میں بھی — خبر ہی جام میں دوران سر یہ کس کا ہے
کھلا نہ خانۂ تن کا بھی اپنے کچھ اسرار — کہ اس مکان میں آخر گذر یہ کس کا ہے
اگر اجل سے ڈریں بھی تو کیا سمجھ کے ڈریں — پھر انتظار ہمیں عمر بھر یہ کس کا ہے

تو روز حشر بھی میں نشہ میں حجب ہوا نظم
خدا سے سلمنا اے بے خبر یہ کس کا ہے

۱۶۳ — ۱۶

نہ اتری بام سے جب تک دو پہر گذرے — ہم ایسے سایۂ دیوار سے بھی در گذرے
جو وار کرنا ہو سفاک تو کر گذرے — کہ آب تیغ کہیں سر سے ہاتھ بھر گذرے
جہاں کی سیر میں انسان بے خبر گذرے — بسان ابر ہے لازم بچشم تر گذرے
کمند آہ کو پھینکوں میں بام گردوں پر — جو گیسوئے شب دیجور تا کمر گذرے
ہماری غنچہ دل سے وہ پھول ہی اچھے — جنہیں ترے خم گیسو میں رات بھر گذرے

نشانہ غیر کو تو نے بنایا تھا جن کا
وہ سب خدنگ مرے دل سے تیر گذرے

تڑپ کے رہ گیا کوئی تو اس کو کیا پروا
کرشمے اپنے نگاہوں سے بیشتر گذرے

غم و الم کی جو راتیں ہیں یہ وہ نہیں کٹتیں
خوشی کے دن تو ادھر آئے بس ادھر گذرے

فقیر ہیں یہ نہیں جھکتے مگر کسی سے ہم
اسی روش پہ سلاطین تاجور گذرے

بھٹکتا رہ گیا واعظ طریق عرفاں میں
خضر کبھی نہ ادھر راہ بھول کر گذرے

گہر سمجھ کے اٹھا لیتے خاک سے ہم کو
نہ اس طرف سے کبھی صاحب نظر گذرے

نہ ہم نے ہاتھ سے سر رشتہ وفا چھوڑا
ہزار ظلم و ستم ایک جان پر گذرے

بنا ہر ایک نفس برق خرمن ہستی
جنوں میں آپ سے جب صورت شرر گذرے

دلوں میں گھر ہے زبانوں پہ ذکر ہے اب تک
کہیں نشاں نہیں ان کا جو نامور گذرے

جو سمجھے حرمت میخانہ تو تو اے واعظ
ادھر سے گذرے تو احرام باندھ کر گذرے

مجھے بھروسہ ہے اے نظم اوس کی رحمت کا
یقین ہے میرے گناہوں سے وہ بھی در گذرے

۱٦۴ — ۱۹

شب فراق میں کب تک قضا نہیں آتی
میں دیکھتا ہوں کہ کیونکر بھلا نہیں آتی

لگ کے چلتے ہیں تیر اور صدا نہیں آتی
یہ سنتے آئے ہیں کہکر قضا نہیں آتی

یہ کس ادا سے پریشاں ہوئے ہیں تیرے گیسو
کہ جیسے ہوش میں باد صبا نہیں آتی

ترا شہید محبت ہے زندہ جاوید
جنازہ اٹھ بھی گیا اور قضا نہیں آتی

بلا کشانِ غمِ عشق کو مبارک ہو
کہ دردِ دل کی کسی کو دوا نہیں آتی

جو پوچھ رازِ حقیقت تو پوچھ رندوں سے
کہ اس طرف کی خبر جا بجا نہیں آتی

غرورِ حسن بتوں کا وہ کوہِ تمکیں ہے
پکار رو لاکھ پلٹ کر صدا نہیں آتی

نہ سیکھے گا کہیں آئینہ سے بے شرمی
کہ اوس کی آنکھ میں مطلق حیا نہیں آتی

جفا کا ذکر جو چھیڑا کہا نہیں سنتے
وفا کو اوس سے جو پوچھا کہا نہیں آتی

جواب صاف ملا ہر طرف سے قاصد کو
اجل بھی ناز سے کہتی ہے جا نہیں آتی

تمہیں جہاں کے حسینوں سے لے گئے بازی
کسی کو چال تمہارے سوا نہیں آتی

غم و الم کا ہے رونا نہ درد کا ہے گلہ
مجھے شکایتِ اہلِ وفا نہیں آتی

نہ جانے بچھڑے ہوئے دوست پھر ملیں نہ ملیں
وہ راہ ہے کہ صدائے درا نہیں آتی

شبِ فراق میں ہے آہ نارسا یہ عجب
کہ آگ خرمنِ مہ میں لگا نہیں آتی

خدا کے سامنے جاتے ہو کس طرح دیکھیں
کسی سے شرم تمہیں تو ذرا نہیں آتی

پیام لا کے کسی کا یہ ہو گیا ہے غرور
بغیر ناز کئے اب صبا نہیں آتی

کریں گے دہر سے کیا شکوہ نامرادی کا
ہمیں کو خود طلبِ مدعا نہیں آتی

اثر کے عرشِ بریں سے مراد آتی ہے
یہاں زباں سے لب تک دعا نہیں آتی

جو منع ہوتیں یہ مستیاں بہار میں نظم
تو جھوم جھوم کے کالی گھٹا نہیں آتی

نکالے پیچ مجھی پر مرے سکھائے ہوئے
چلے مجھی پہ وہ فقرے مرے بتائے ہوئے

چلے گا سرو جو دامن کو یوں اٹھائے ہوئے
کہوں گا منہ پہ یہ انداز ہیں اڑائے ہوئے

جو بزمِ انس میں ہیں تجھ سے لو لگائے ہوئے
تمام خلق سے بیٹھے ہیں منہ پھرائے ہوئے

کہو فلک سے گریباں ذرا بچائے ہوئے
چلا ہے نالۂ دل آستیں چڑھائے ہوئے

لٹک پڑے اتر آ آنچل تو سیکڑوں فتنے
اوٹھیں گے دامنِ محشر میں یہ چھپائے ہوئے

کہیں چھپائے سے چھپتی ہے شب کی بیخوابی
نگاہیں کہتی ہیں جادو ہیں یہ جگائے ہوئے

خبر کرے کوئی ان کو مری اسیری کی
جو ہیں ہوائے چمن کا فریب کھائے ہوئے

گر آفتابِ قیامت نہ گرمیاں ہم سے
ہم آپ میں عرقِ شرم میں نہائے ہوئے

حساب ہم سے بروزِ شمار کیا ہو گا
کہ چند روز میں وہ بھی گئے بھلائے ہوئے

جنوں نے دیر کا رکھا ہمیں نہ کعبہ کا
ٹھکانے چھوٹ گئے سب لگے لگائے ہوئے

متاعِ صبر و خرد اک نگاہ میں لے لی
یہ کب سے بیٹھے تھے مجھ پر ادھار کھائے ہوئے

غرورِ حسن غرورِ شباب استغنا
شراب کی ہیں کئی بوتلیں چڑھائے ہوئے

ہو نہیں یا ہو رشک حسینوں میں دیکھ کر مجھ کو
لگی ہے آگ کہ پھرتے ہیں تلملائے ہوئے

مری طرف نگہ ناز اور عتاب آمیز
لگاؤ تیر بھی اور زہر میں بجھائے ہوئے

ہنسی بھی آ گئی تو تم کو بزمِ ماتم میں
ابھی تو آنکھوں میں آنسو تھے ڈبڈبائے ہوئے

دکھایا پیرِ مغاں نے وہ جام میں جلوہ
کہ غش ہیں حضرت موسیٰ میں جان لائے ہوئے

کیا ہے قصد تو میخانہ سے نکلنے کا
مگر ابھی سے ہیں کچھ پاؤں لڑکھڑائے ہوئے

صلہ ملے تجھے کوثر پہ اس کا اے ساقی
کہ میکدے سے چلے پیاس ہم بجھائے ہوئے

وہ چاہے قتل کرے چاہے وہ رہا کردے
کھڑے ہوئے ہیں گنہ گار سر جھکائے ہوئے

گلہ کروں گا نہ میں جو نصیب کا لکھا
قلم چلا ہے نہیں بے ہاتھ کے ہلائے ہوئے

بروز حشر میں انکا مزاج پوچھوں گا
ترے جو وعدے پہ ہیں اعتبار لائے ہوئے

اب اوس شاخ کو جھک جھک کے ڈھونڈتے ہیں ہم
زمانہ گذرا جسے خاک میں ملائے ہوئے

نظر لگے نہ کہیں آفتاب محشر کی
کفن میں لے چلے داغ وفا چھپائے ہوئے

اوٹھائے صور قیامت نہ خواب فتنہ سے
مصیبتیں شب غم کی ہیں ہم اٹھائے ہوئے

پیالہ پینے کو بیٹھے ہو گر تو ہاں رندو
نظر ہے پیر مغاں کی نظر ملائے ہوئے

چلا ہے نظم کہاں کشمکش میں یارو رنگی
بغل میں شیشۂ دل ہے ذرا بچائے ہوئے

۱۶۶ —— ۱۸

حسین ہو کے تکبر ضرور ہوتا ہے
ادا میں فتنہ نگہ میں فتور ہوتا ہے

جو ہونے والا ہے وہ تو ضرور ہوتا ہے
بری بلا یہ دل ناصبور ہوتا ہے

ہر ایک شے سے اسی کا ظہور ہوتا ہے
کہ آفتاب کا ذرّوں میں نور ہوتا ہے

ہر ایک قطرے میں دریا ہے کوئی کیا جانے
وہی سمجھتے ہیں جن کو عبور ہوتا ہے

زہے غبار شہیدان حسرت و طرب
اوٹھے تو عرش جو بیٹھے تو طور ہوتا ہے

بھلا سحر تو شب ہجر کی کہاں لیکن
کفن سپیدہ صبح نشور ہوتا ہے

ہوا بہشت کی آتی ہے جب تو ساغر میں — چھلک کے جام شراب طہور ہوتا ہے
دل اپنا آپ سے دیتا نہیں کسی کو کوئی — یہ ظلم ہوتا ہے اور بے قصور ہوتا ہے
چھپیں نہ ریزۂ مینا کی طرح کیوں تہ گل — کوئی بھی نشہ میں اس طرح چور ہوتا ہے
قیام کب ہے جو حاصل بھی ہو فراوانی — ہوا یہ سایۂ بالِ طیور ہوتا ہے
سرائے دہر میں ہے کون آشنا کس کا — کہ صبح و شام ورود و صدور ہوتا ہے
فروتنی میں کچھ ایسی ادا نکلتی ہے — کہ انکسار پہ اپنے غرور ہوتا ہے
کیا نشیب و فراز جہاں کو جب ہموار — نہ دل میں رنج نہ پیدا سرور ہوتا ہے
نہیں علاج منافق کی روسیاہی کا — جو دل ہو صاف تو چہرے پہ نور ہوتا ہے
اوسے کرم پہ ہے اصرار ہم کو عصیاں پر — اودھر سے عفو ادھر سے قصور ہوتا ہے
کیا ہے اوس نے ہر اک سے وصال کا وعدہ — اس اشتیاق میں مرنا ضرور ہوتا ہے
سراب ہے جسے سمجھے ہوئے ہوں میں دریا — کہ جتنا بڑھتا ہوں اوتنا ہی دور ہوتا ہے

جنوں نے کھینچا ہے دامن مرا اودھر اے نظمؔ
ہر ایک خار جہاں نخلِ طور ہوتا ہے

١٦٧ ہ

کبھی سینے سے ذرا پاس آکے بیٹھ گئے — نگاہ پھیر کے تیوری چڑھا کے بیٹھ گئے
کچھ اس ادا سے چلا ہے تو اوٹھ کے محفل سے — کہ دل بھی ساتھ ترے نقش پا کے بیٹھ گئے
نگاہِ یاس مری کام کر گئی اپنا — رولا کے اوٹھے تھے وہ مسکرا کے بیٹھ گئے

سحر کو اوٹھتے ہیں وہ دیکھ کر کف رنگیں
اب آئینہ پہ بھی سکے حنا کے بیٹھ گئے

تڑپنا دیکھ سکے وہ نہ صید کا اپنے
نشانہ تیر نظر کا لگا کے بیٹھ گئے

یہ بزم بادہ کشوں کی ہے حضرت واعظ
غضب کیا یہ کہاں آپ آکے بیٹھ گئے

جو در پہ اس کے ٹھہرنے دیا نہ دربانے
تو سامنے در دولت سرا کے بیٹھ گئے

چلا جو تیر تو سینہ سپر کیا ہم نے
اوٹھی جو تیغ تو گردن جھکا کے بیٹھ گئے

فلک سے کیا طلب مدعا کرے کوئی
در قبول پہ پہرے قضا کے بیٹھ گئے

کھڑے ہوئے تھے سلاطین کے جو بلند مکاں
عروج اپنا فلک کو دکھا کے بیٹھ گئے

گرائے ابلق ایام کب وہ گرتے ہیں
جو شہسوار کہ پٹری جما کے بیٹھ گئے

نظر کہیں نہیں اب آتے حضرت ناصح
سنا ہے گھر میں کسی مہ لقا کے بیٹھ گئے

قدم ہی اوٹھتا نہیں میکدے سے جانیکو
ابھی اٹھے تھے یہاں سے پھر آکے بیٹھ گئے

وہ اب کہاں ہیں جو پہلے تھا نظم بر عالم
کہ سر پہ بار مصائب اٹھا کے بیٹھ گئے
قمر

١٦٨ ——— ٩

ہوئے نہ ہم تو پشیماں کبھی وفا کر کے
تجھے بھی شرم کبھی آئی ہے جفا کر کے

سنبھلیے حضرت زاہد یہ بزم رنداں ہے
بلائیں ہم تو پڑے آپ کی صلا کر کے

خوشی یہ ہے دم آخر تھا لب پہ نام ترا
کٹی ہے عمر کی منزل حمد خدا کر کے

غضب میں ہے تو پہنچیگی بھیک گر تجھ کو
در کرم پہ آئے چلے صدا

کسی کو حیف اس انجام کی نہیں ہے خبر
مآل دیکھیے فوارہ کے اوچھلنے کا
ہوئی جو کچھ شنوائی جہاں کو ہے معلوم
زبانِ شعلہ سے گلخن میں برگِ گل نے کہا

چلے جہاں سے کیا ساتھ لوگ کیا کر کے
خزانہ ہو گیا خالی ذرا ذرا کر کے
ذلیل اور ہوئے ان سے التجا کر کے
خدا فقیر بنائے نہ بادشا کر کے

قطعہ

بڑے بڑوں کا یونہی زور ڈھے گیا اے ظلم
کوئی جہاں میں برپا ہوا جفا کر کے

۱۶۹

مزہ بہار کا اب ہے تو اے جنوں نکلے
جو تیرے دوش پہ ہم اے سپہرِ دوں نکلے
مراد مانگنے لینے کو ہم شگوں نکلے
کسی کی چشمِ سخن گو کے جو اشارے تھے
ستارے شام کے ڈوبے ہوئے سرِ شام ہیں
وہ اہلِ ذوق جو عزلت گزینِ خلوت تھے
دل و جگر یہ ہمیں نازہ تھا مگر وہ بھی
سکھا فلک مجھے طرزِ فغانِ موسیقار
اگرچہ حسن کو بھی جوئے شیر کی خواہش
عجب یہ ہے کہ یہاں سرکشی کرے انسان

۱۷۰

شکستِ توبہ سے آوازِ ارغنوں نکلے
خرابِ میکدۂ جامِ واژگوں نکلے
کہیں نہ بھیس بدل کر وہ ذوفنوں نکلے
نظر پڑی تو سب افسانہ و فسوں نکلے
سحر کو نکلے تو با حالتِ زبوں نکلے
زخود رمیدۂ ہنگامۂ جنوں نکلے
ہلاکِ غمزۂ جادوئے ذوفنوں نکلے
کسی طرح سے تو کچھ آتشِ دروں نکلے
بکارِ عشق کہ تیشہ سے جوئے خوں نکلے
یہاں کہ سات فلک ہو کے سرنگوں نکلے

تمہارے جلوہ کے آگے کسی کی ہستی ہے
تمہارے سامنے کس کی زبان سے ہوں نکلے

وہ شب کی دست درازی اسی نکہت ہے
سحر کو ہاتھ جو دیکھے تو نیلگوں نکلے

زمینِ شعر جواہر کی کان ہے انظم
کمال یہ ہے کہ جو منہ ہی میں کیوں نکلے

۱۷۰ — ۱۹

چلی صبا کہ چمن میں گذر نہیں نہ سہی
کھلے شگوفہ کہ مٹھی میں زر نہیں نہ سہی

نمود و بود سرابِ جہاں کی فکر عبث
اگر ہے کچھ تو ہمیں کیا اگر نہیں نہ سہی

مزہ حکایتِ تیرِ نگہ میں کیا کم ہے
اگر شکایتِ زخمِ جگر نہیں نہ سہی

نہ کوئی بات کہیگا دہن نہیں تو نہ ہو
نہ کوئی نام دھرے گا کمر نہیں نہ سہی

کب ایسے حال کی مجھ کو خبر ہے اے ناصح
اگر وہ حال سے میرے خبر نہیں نہ سہی

نسیمِ صبح نہ آئے تو خوابِ مرگ تو آئے
سن اے فلک شبِ غم کی سحر نہیں نہ سہی

تمہیں تو اپنے تغافل پہ ناز ہے بیجا
مجھے تحملِ دردِ جگر نہیں نہ سہی

ٹھہر کے بزمِ شبِ عیش دیکھ لے اے چرخ
جو ایک رات یہ دورانِ سر نہیں نہ سہی

یہ خشک ہی ہیں جو کلیاں تو پھول مت دیا
غرض کہ کیجئے نالے اثر نہیں نہ سہی

لحاظِ خاطرِ زاہد ضرور ہے ساقی
ادھر تو دے کوئی ساغر ادھر نہیں نہ سہی

اجل ہے سر پہ سوار اور سامنے رخِ یار
قدم تو اب نہیں اٹھنے کا سر نہیں نہ سہی

شہید ہونے کو رکھا ہے پاؤں مقتل میں
ظفر نصب میں تیغ و سپر نہیں نہ سہی

کسی کی آہ سے پتھر تو ہو چکا پانی
کسی کے دل پہ جو لب بھی اثر نہیں نہ سہی

ترا خیال ہے اور میں ہوں اور دل بیمار
کوئی انیس کوئی چارہ گر نہیں نہ سہی

ہمارے دل میں تو ہر لحظہ ہر گھڑی تم ہو
تمہاری بزم میں اپنا گذر نہیں نہ سہی

فلک سے ہم نہیں جھکنے کے لاکھ مٹ جائیں
دماغ تو ہے وہی تاج زر نہیں نہ سہی

مزہ ہے اہل توکل کو روکھی روٹی کا
نمک نہیں نہ سہی یا شکر نہیں نہ سہی

یہی سمجھ کے سناتا ہوں درد دل اپنا
کہ جی تو بہلے گا اس کا اثر نہیں نہ سہی

مرا قلم تو جواہر اگل رہا ہے نظمؔ
جہاں میں گر کوئی حافظ نہیں نہیں سہی

یہ نہ میں سمجھا نکالا تو نے بزم انس سے
لے گئی یاد دشت امکاں کی طرف وحشت مجھے

دل کی محویت کا وہ عالم ابھی تک یاد ہے
آپ میں آنے کی ممکن ہی نہ تھی فرصت مجھے

محو دنیائی کا عالم خود پرستی کا ہے دور
بیخودی رہتی ہے اب ویسی نہ محویت مجھے

مجھ کو منزل سے خودی کی ہے سفر تیری طرف
ہو گئی تیری جدائی عالم غربت مجھے

جتنا بڑھتا ہوں میں اتنا ہی پیچھے ہٹا جاتا ہے
دور کرتی رہتی ہے تجھ سے مری حیرت مجھے

آسماں میں تو نہیں ہے لامکاں میں تو نہیں
تجھ کو پا سکتا نہیں میں لاکھ ہو رفعت مجھے

اک نمائش ہے سراب زیست کی سارا جہاں
ایک باغ سبز سے بڑھ کر نہیں جنت مجھے

شان تیری یہ کہ بے مانگے دو عالم دیدیا
حال میرا یہ کہ اب بھی رہ گئی حسرت مجھے

١٢٣ فاعلاتن فاعلاتن فاعلاتن فاعلات ١٧١

ہو گئے کیا کیا ستم اب تو نہیں کچھ یاد بھی
دل تھا پہلو میں تو کرتے تھے کبھی فریاد بھی

میں تو صید تازہ تھا جو کا مگر صیاد بھی
پلکیں ٹانکی تھیں تو سی دیتا لب فریاد بھی

تکیہ رکھتے ہیں خدا پر ہیں فقیر آزاد بھی
کم نہیں کملی ہے ہم کو سایۂ شمشاد بھی

دل فریبی پر تلے ہیں سرو بھی شمشاد بھی
جاں ستانی پر کمر باندھے ہوئے صیاد بھی

میں بھی اس گلشن میں ہوں اور خانۂ صیاد بھی
نالہ وہ کھینچوں کہ جس میں برق بھی ہو باد بھی

غم نہیں اس کا اگر میں ہو گیا برباد بھی
دل تو ہے پہلو میں اور دل میں تمہاری یاد بھی

یاد ہے شیون بھی مجھ کو نالہ بھی فریاد بھی
آپ کو مرغوب کیا ہے کچھ تو ہو ارشاد بھی

اب تو قائل ہے وفا کا وہ ستم ایجاد بھی
ظلم بھی ہے رحم بھی ہے داد بھی بیداد بھی

کم نگاہی اس قدر بے التفاقی اس قدر
اک نگہ پر ہم بکے بھی ہو گئے آزاد بھی

آنکھیں پھوٹیں اوس کی جو منکر ترے جلوہ کا ہو
دیکھتا ہے یہ کرشمے کورِ مادرزاد بھی

رشکِ یکتائی کہاں تک تا کجا قہر و غضب
خاک میں تو مل چکے نمرود بھی شداد بھی

دیکھنا اس خوابِ نوشیں کو نہ چونکے ہم ذرا
شورِ ماتم بھی رہا شورِ مبارک باد بھی

کی سوادِ شہرِ خاموشاں نے کچھ ایسی کشش
منزلوں پیچھے رہی مجھ سے مری فریاد بھی

سایۂ گلبن میں بلبل کو اترتے دیکھکر
چال پر چھائیں کی سی چلنے لگا صیاد بھی

دل سے بھاتی ہے وفا اہلِ وفا کی اسقدر
جان دے کر مول لوں درد سرِ فرہاد بھی

ایک تو منزل کٹھن ہے اور پھر ہر گام پر
حادثہ پر حادثہ افتاد پر افتاد بھی

قطعہ

حشر میں ظالم نے یہ کہہ کر گلا گھونٹا مرا
ایک تو اپنا قصور اور اس پہ یہ فریاد بھی

میں تو اب چپ ہوں مگر اس خونِ ناحق کا گواہ
دامنِ جلّاد بھی ہے خنجرِ فولاد بھی

لوحِ دل سے نقشِ ہستی کو مٹا کر بارہا
توڑ ڈالا ہے طلسمِ عالمِ ایجاد بھی

میرے اشک و آہ پر جو باندھنوں باندھے گئے
یوں نہ اٹھا تھا کبھی طوفانِ ابر و باد بھی

سیج پر پھولوں کی اس نے کروٹیں لیں رات بھر
گندھ گیا تھا ہار میں شاید دلِ ناشاد بھی

ناز اس بوٹا سے قد پر کیوں نہ ہو زیبا تجھے
جھومتے ہیں سرو بھی اٹھلاتی ہیں شمشاد بھی

یہ غزل خوانی نہیں ای نظم ہے صورتگری
بار بد بھی محوِ حیرت ہو گیا بہزاد بھی

۱۷۲ ۱۶

چپ رہوں میں جب سی جوشِ عشق میرے دلمیں ہے
زور و شورِ موج کا پیدا اثر ساحل میں ہے

ابرِ تر ہے یا کہ ہے خمخانۂ کیفِ بہار
شاخِ گل ہے یا کہ پیمانۂ کفِ ساحل میں ہے

تھی لہو کی چھینٹ باقی میرے جسمِ زار میں
وہ بھی کچھ تلوار میں کچھ دامنِ قاتل میں ہے

مر مٹے دریا تلک آ آ کے لاکھوں تشنہ لب
استخوانوں کی صدا خمیازۂ ساحل میں ہے

جان دینے کا مزہ اہلِ وفا سے پوچھئے
مر چکے ہیں پھر بھی مر جانے کی حسرت دل میں ہے

دیدۂ بیدار میں ہے ہُو کا عالم ہر طرف
بزمِ ہستی خواب ہے اور دیدۂ غافل میں ہے

میں کسی کے منہ پہ رکھوں بات یہ عادت نہیں
ورنہ ہے میری زبان پر جو تمہارے دل میں ہے

کچھ نہ میں سمجھا کہ آخر میں ہوں تو یا تو ہے میں
کچھ نہیں کھلتا کہ دل تجھ میں ہے یا تو دل میں ہے

کشتنی سمجھے لگے بس پھیرنے گردن پہ تیغ
یہ تو پوچھا ہوتا کچھ حسرت بھی تیرے دل میں ہے

ناتواں تھا میں اوٹھا سکتا نہ سختی راہ کی

بات اتنی ہے کہ دم اٹکا ہوا منزل میں ہے

اس کی چشم سرگیں سے ہو رہا ہے قتل عام
مشعلیں روشن ہیں اور اندھیر اس محفل میں ہے

خونِ ناحق کا پتہ دیتی ہیں تیری شوخیاں
کچھ یہی انداز تو بیتابِ بسمل میں ہے

ناقہ ہے زنجیرِ مجنوں کی کمندِ آہ کا
بچ کے جا سکتی نہیں لیلیٰ اگر محمل میں ہے

کونسی جا جلوۂ جاناں نظر آتا نہیں
دل میں ہے آنکھوں میں ہے خلوت میں ہے محفل میں ہے

تیرا افسوں چل گیا عالم پہ اے زہرہ جبیں
ہند میں تو اور افسانہ ترا بابل میں ہے

کس مصور نے بنایا آنکھ کی تصویر کو
دیکھ لو سارا طلسماتِ جہاں اک تل میں ہے

۱۲ ۱۷۳

زندگی جن سے تھی وہ مجمع پریشاں ہو گئے
سخت جاں تھے ہم کہ پھر جینے کے ساماں ہو گئے

آکے مقتل میں ترے کتنے سلیماں ہو گئے

تیر جو اوڑتے ہوئے آئے تھے پریاں ہو گئے

حلق سے اوتری بھی تو اوتری لہو ہو کر شراب

ہجرِ ساقی میں مجھے دو گھونٹ چھریاں ہو گئے

مذہبِ اہلِ وفا میں رو کے میں مجرم ہوا

اشک گر کر آنکھ سے دست و گریباں ہو گئے

کیا بتاؤں رو رہا ہوں کب سے اے اہلِ جہاں

نوح کے کتنے ہی اس عرصے میں طوفاں ہو گئے

کبرِ حسن کا بڑھ گیا حد سے وہ ہیں تنگِ جہاں

جو کہ جامہ سے ہوئے باہر وہ عریاں ہو گئے

آنسوؤں میں ہے مرقع مجمعِ احباب کا

دیکھتے ہی دیکھتے آنکھوں سے پنہاں ہو گئے

قصرِ قیصر تک فرشتہ جا نہ سکتا تھا کبھی

کیا قضا آئی تو اندھے سب نگہباں ہو گئے

جانْ جائیگی نہ چھوڑیں گے درِ میخانہ اب

ہم سے اور پیرِ مغاں سے عہد و پیماں ہو گئے

رہ گئے جی کھول کر رونے کی جو ارمان تھے

چبھتے چبھتے دل میں آخر زخم خنداں ہو گئے

کیا سمجھ کر جان دینے کو کہا تھا آپ نے
دیکھ کر لاشہ کو کیا جلدی پشیماں ہو گئے

دی جو گیسو میں گرہ آنچل سرک جانے لگا
جب لیا آنچل تو پھر گیسو پریشاں ہو گئے

مڑ کے دیکھا اوس نے دل سینوں میں بسمل کر دیے
منہ اودھر پھیرا تو جو بسمل تھے بے جاں ہو گئے

16 ولہ ۱۷۴

دیکھنا شورش و فورِ گریۂ سرشار کی
گرد ہو بیٹھی جاتی ہے گھٹا اُس پار کی

سنگِ بارانِ ستم کا ہو رہا ہے مشورہ
کرتی ہیں گردوں سے باتیں چوٹیاں کہسار کی

ہم نے وہ میدان مارا ہے کہ جس میں ہر طرف
آرزو کا خون ہے یا لاش ہے پندار کی

شش جہت ہے اک گھروندا رہ گذارِ سیل پر
جس میں گردوں ایک چلتی چھاؤں ہے دیوار کی

سب کو قسمت نے کیا ہے لا کے اس زندان میں قید
رہنے والی ہے اجل جس گنبدِ دوّار کی

جان دے کر مر کے پہنچا ساحلِ مرقد پہ میں
جھیل کر آفت بھنور کی موج کی منجدھار کی

صفحۂ عالم پہ طومارِ شبِ غم ہے رقم
مہر ہے اس پر ہمارے دیدۂ بیدار کی

بند ہو کر آنکھ پھر کھلنے کی ہے کس کو امید
لوٹ لے جلتی ہے دولت دیدۂ بیدار کی

دن جو ہیں اپنے خزاں کے کچھ بھلا لگتا نہیں
یہ فضا یہ چھاؤں یہ ٹھنڈی ہوا گلزار کی

ابر کو جوشِ جنوں میں دیکھ کر کہتا تھا میں
اوڑ رہی ہیں دھجیاں کیا دامنِ کہسار کی

موج ہے آبِ گہر کی مسکرا دینا ترا
شعلۂ یاقوت ہے جنبش لبِ گفتار کی

ہاتھ میں لے آئینہ کیطرح مشتاقوں کا دل
اوس میں صورت دیکھ اپنے نخوت و پندار کی

دیکھنے کی ہیں ادائیں سیکڑوں اور اک نگاہ
لکھی ہے قسمت میں گردش مردمِ بیمار کی

دشتِ حیرت میں تھا سرگرداں کہ اٹھا گردِ باد

کھل گئی مجھ پر حقیقت گنبدِ دوار کی

جلوہ اس کافر کا جب دیکھا تو رکھ دی ہاتھ مینے

مردم دیدہ نے سمرن آنسوؤں کے تار کی

نیم بسمل ہے نہ مرتا ہے نہ اب جیتا ہے نظم

پڑ گئی اوچھی سروہی ابروئے خمدار کی

15   175

آکے مجھ تک کشتیٔ مے ساقیا اولٹی پھری

آج کیا ندی بھی الٹی ہوا اولٹی پھری

آتے آتے لب پر آہِ نارسا اولٹی پھری

وہ بھی میرا ہی دبانے کو گلا اولٹی پھری

مڑ کے دیکھا اوس نے اور وار ابرو کا چل گیا

اک چھری سیدھی پھری اور اک ذرا اولٹی پھری

لاسکا نظارۂ رخسار روشن کی نہ تاب

جا کے آئینہ پہ چہرہ کی ضیا اولٹی پھری

رابت بازوں ہی کو پیسا آسماں نے آتے دن

وائے قسمت جب پھری یہ آسیا اولٹی پھری

جو بڑا بول ایک دن بولے تجھے پیش آیا وہی

گنبدِ گردوں سے ٹکرا کر صدا الٹی پھری

رزق کھا کر غیر کی قسمت کا نہ ہو رعمل

تو نے دیکھا حلق تک جا کر غذا الٹی پھری

تو ستائش گر ہے اوس کا جو ہے تیرا مدح خواں

یہ تو اے مشفق ضمیرِ مرحبا[لہ] الٹی پھری

جس پہ آئی تھی طبیعت کی اوسی نے کچھ نہ قدر

جنسِ دل مانندِ جنسِ ناروا الٹی پھری

یا تو کشتی ڈوبتی تھی یا چلی ساحل سے دور

وائے ناکامی پھری بھی تو ہوا الٹی پھری

گرنے والا ہے کسی دشمن پہ کیا تیرِ شہاب

آسماں تک جا کے کیوں آہِ رسا الٹی پھری

بچ گیا میں اوس کے آ جانے سے دشمن مر گیا

دیکھ کر عیسیٰ کو بالیں پر قضا الٹی پھری

مر گیا بے موت میں آخر اجل بھی دور سے

کوچۂ قاتل کا بتلا کر پتا الٹی پھری

لہ یعنی مرحبا تک میں جو ضمیر ہے یا مرحبا بہ میں جو ضمیر ہے ان دونوں ضمیروں کی جگہ ضمیر متکلم مقصود ہے یعنی مرحبا بی ۱۲

ہجر کی شب مجھ کو اولٹی سانس لیتے دیکھ کر
ایک ہی دم میں وہاں جا کر صبا اولٹی پھری
ہے مرا ویرانۂ غم تنگِ لحد سا ہولناک
موجِ سیل آئی تو لے کر بوریا اولٹی پھری

١٥ — ١٦

ایک دم کو حسنِ گل سے گلشن آرائی ہوئی
اک نظر اس باغ میں شبنم تماشائی ہوئی
صبحِ پیری اور غفلت اس قدر چھائی ہوئی
مسکراتی ہے سرِ بالیں اجل آئی ہوئی
خندہ زن گل ۔ لب پہ غنچوں کے ہنسی آئی ہوئی
اے صبا کچھ خیر ہے چال ایسی اٹھلائی ہوئی
اک قدم ہے اندرونِ خانہ اک بیرونِ در
سانس قالب میں جو آئی بھی تو گھبرائی ہوئی
منہ سے نکلی بات اور طوفاں پہ طوفاں اٹھے
اشک ٹپکا اور رسوائی سی رسوائی ہوئی
مڑ کے میں دنیا و عقبیٰ کیطرف کیا دیکھتا
مانعِ وہمِ دو عالم تیری یکتائی ہوئی

باز آئے کب سیہ کاری سے ہم مثلِ قلم
مدتوں سجدے رہے برسوں جبیں سائی ہوئی
باغِ عالم میں بہارِ زندگانی ہو تو کیا
ایک ہی دل کی کلی اور وہ بھی مرجھائی ہوئی
کج روی طینت میں ایسی ہو تو اس کا کیا علاج
راہ تو سیدھی ہے لیکن چال کترائی ہوئی
کوئی رسوائی تک آنے کو نہ اوٹھا تھا قدم
دستگیر آخر کمندِ ناشکیبائی ہوئی
عشق کے شعلوں کو اب تو ہی بجھا دے چشمِ تر
یاد کر یہ آگ ہے تیری ہی بھڑکائی ہوئی
کھل گئے گل، عقدۂ دل ناکشودہ ہی رہا
ناخنِ موجِ صبا سے بھی نہ گیرائی ہوئی
شام سے سوزِ شبِ غم نے مجھے دہلا دیا
شمع کے منہ پر جو دیکھی مردنی چھائی ہوئی
گنبد اک وہ بھی ہے وہم و شک کی بازی گاہ کا
بات جو سمجھی ہوئی ہے یا ہے سمجھائی ہوئی
ہے وہی علت عدم کی جو ہے علت کا عدم

باعث ہنگامہ اپنی ناشناسائی ہوئی

۱۸۷ ۳۶

عشق میں جب تک جنوں کی کارفرمائی نہ تھی
گرمیٔ ہنگامہ بازارِ رسوائی نہ تھی

شغل خود بینی نہ تھا شانِ بزم آرائی نہ تھی
جلوہ گر تھا یار اور چشم تماشائی نہ تھی

کیا سمجھ کر دشت میں جاتا بہار آئی نہ تھی
کس طرح بن جھوم کر او گھٹا چھائی نہ تھی

مجھ کو آوازِ شکستِ رنگ نے رسوا کیا
ورنہ دل کی بات تو لب تک کبھی آئی نہ تھی

جنگلوں میں خاک چھانی ہے جوانی کے لئے
منزلوں گردِ رم آہوئے صحرائی نہ تھی

لذتِ دنیا کے خمیازہ کو ہم زندوں سے پوچھ
دم نکلنے کی یہ تھی تصویر انگڑائی نہ تھی

بقیہ ۲: نہ اپنی ناشناسائی ہنگامہ ممکنات کا باعث ہوئی یعنی ہم خود کو نہ پہچان سکے سمجھے کہ ہم بھی ہیں تو ساری کائنات کا ہونا لازم ہے ہر ناشناسائی یعنی عدم ادراک ہی ادراک عدم کا باعث ہوا اس طرح ممکن کے لئے عدم ترجیح ترجیح عدم کا باعث ہے ۔

ترک لذت میں بھی کچھ دل کو مزہ ملنے لگا
ورنہ کیا مجھکو ہوائے بادہ پیمائی نہ تھی

وصل کیا ہوتا کہ طبع یار تھی خلوت پسند
اور اپنے گوشۂ خاطر میں تنہائی نہ تھی

جلوۂ گل کے تھے مشتاقوں میں ہم اک عمر تک
اور نرگس کی طرح آنکھوں میں بینائی نہ تھی

کون ہوں میں یاد ہوگا آپ کو یہ اے کلیم
برق ایمن سے کسی نے آنکھ جھپکائی نہ تھی

یا تو لے سکتا نہ تھا میں سانس یا تڑپا کیا
جان تازہ تھی یہ شاید ناشکیبائی نہ تھی

چشم تر پر دیکھنا دامن کسی نے آج تک
رہگزار سیل میں دیوار اٹھوائی نہ تھی

سوتے سوتے شور محشر جاگ اوٹھا کس طرح
اے جنوں میں نے ابھی زنجیر کھڑکائی نہ تھی

ترک الفت کرکے نکھرا اور بھی کافر کا رنگ
دل کو حسرت ہے کہ پہلے تو یہ رعنائی نہ تھی

دیکھنا ہے سیر اگر میرے تڑپنے کی تو دیکھ

یہ نہ کہہ بنا کہ بسمل میں شکیبائی نہ تھی
ساتھ غیروں کے تھے ہم بھی دور ساغر میں تبریک
پی رہے تھے خون اپنا بادہ پیمائی نہ تھی
اب کہیں دل سے لگی رہتی ہے تلووں سے کہیں
یوں کبھی رنگِ حنا نے آگ بھڑکائی نہ تھی
وہ تو آنکلا تھا لیکن ہوگئی کیا جلد صبح
میں نے ابتک زلف بھی چہرہ سے سرکائی نہ تھی
بات کی تو نے تنِ بیمار میں جان آگئی
سچ بتا ناپھر یہ کیا تھا گر مسیحائی نہ تھی
آگیا کیا چین مجھ کو گر کے اس کے پاؤں پر
یہ علاج دردِ سر تھا ناصیہ سائی نہ تھی
صورِ اسرافیل سے بس جاگنے والا نہ تھا
کیا کہیں تو نے تو آکر قبر ٹھکرائی نہ تھی
ہم سے بچ کر تخت پریوں کا نکل جانا کہاں
اتنی بھی کو نہ سمندِ ناشکیبائی نہ تھی
کشتی مے پر ہے اب تختِ سلیماں کو بھی رشک
بادہ پیمائی تھی آخر بادِ پیمائی نہ تھی

قلزمِ مے میں ہیں سر سے پاؤں تک ڈوبے ہوئے
آ گئی تھی لہر اک مستوں کی انگڑائی نہ تھی

زندگی گذری ہے کیونکر سچ بتانا اے اجل
لاکھ بار آئی تھی تو کچھ ایک بار آئی نہ تھی

ہم نے عالم میں کہیں دو دل ملے دیکھے نہیں
ان میں یکرنگی نہ تھی تو ان میں یکجائی نہ تھی

فرش استبرق بچھایا تھا نگاہِ شوق نے
حشر کے دن ہم کو فکرِ برہنہ پائی نہ تھی

کیوں نکل کر تو ہوا خلوت سے زیبِ انجمن
حسن بے پردہ تھا جب تک یہ رسوائی نہ تھی

کام مشکل آ پڑا تھا اور نہ تھا عزم درست
عقدہ تھا دشوار اور ناخن میں گیرائی نہ تھی

پھیر لیتی ہے نگہ تصویر بھی اس شوخ کی
پوچھتا ہوں جب کہ ہم سے کیا شناسائی نہ تھی

مہرباں ہوتے غریبوں پر تو گھٹ جاتی نہ شان
کیا تم آ جاتے تو میری قدر افزائی نہ تھی

پست ہو جانے سے اپنے ہو گیا تیرا عروج

ورنہ کچھ تیری بساط اے چرخ مینائی نہ تھی

ہم تھے ساقی تھا ہمارا میکدہ تھا جام تھا
جب زمانہ میں بنا ہے چرخ مینائی نہ تھی

میرے لب سے ہو گیا کیسا گل رخسار سرخ
تیرے لب سے برگ گل اس طرح شرمائی نہ تھی

راہ میں شل ہو گیا برہان وحجت کا قدم
پیروی عقل نادانی تھی دانائی نہ تھی

پوچھتا ہے نظم مجھ کو نرگس بیمار سے
کیوں چلی آئی چمن میں گر توانائی نہ تھی

۱۱

۱۷۸ شرم یہ کیوں یہ تبسم ہائے پنہاں کس لیے
سر پہ آنچل کس لیے منہ پر ہے داماں کس لیے

غور کر طرز جفا کو دیکھ انداز وفا
تیغ گریاں کس لیے ہے زخم خنداں کس لیے

کھول کر بند کفن پوچھے کوئی احباب سے
منہ چھپا کر جاتے ہیں اس گھر سے مہماں کس لیے

سر بزانوئے توکل تن بہ آغوش رضا

ذکرِ سر کس واسطے ہے فکرِ ساماں کس لئے

صحبتِ بے مغز گر اندازِ ساماں ہوتی نہیں
دردِ سر رکھتا ہے پھر شیرِ نیستاں کس لئے

سن کے حرفِ آرزو جامہ سے کیوں باہر ہوئے
خیر ہے کچھ ہو گئے شمشیرِ عریاں کس لئے

منہ سے تو نے کہہ دیا جو آ گیا مجھ کو یقیں
جھوٹی قسمیں کس لئے ہیں عہد و پیماں کس لئے

ہو کے تائب شیخ سے بیعت بھی کر کے دیکھ لی
جا کے اب باندھوں نہ پیمانے سے پیماں کس لئے

اک نگاہِ لطف ہو اوس کی تو یہ سب ہیں نثار
جان و دل کس واسطے ہیں دین و ایماں کس لئے

خضر بھی ہیں غرقِ گردابِ اجل میں ایک دن
اے سکندر ہے تلاشِ آبِ حیواں کس لئے

کس بہارِ حسن سے اے نظم تھا تو ہمکنار
چاک ہیں گل کی طرح جیب و گریباں کس لئے

١٧٩ ٦

مے پلا ساقی ارے فصلِ بہار ایسے میں ہے

آبِ حیواں دے حیاتِ مستعار ایسے میں ہے

سچ ہے اے ناصح کہ یہ ہنگامِ مے نوشی نہیں

مجھ کو جلدی ہے کہ دستِ اختیار ایسے میں ہے

پھر نہ یہ سمرن ملے گی یادِ حق کے واسطے

آنسوؤں کا پنجۂ مژگاں میں تار ایسے میں ہے

وقت ہے حیدر رمیدہ جا کے آنیکا نہیں

وار کرنا ہو تو کر زور پرستا ایسے میں ہے

بعد اس کے پھر گلے سے بھی ملا قاتل تو کیا

پھیر دے آ کر چھری دل بے قرار ایسے میں ہے

دیکھ تو حیدر کوئی تیرا ابھی ہے پرسانِ حال

چند ساعت اور ابھی روزِ شمار ایسے میں ہے

۱۸ ۱۸۰

سنگ پانی ہونے کو پانی ہوا ہونے کو ہے

دیکھ اے منکر یونہی دنیا فنا ہونے کو ہے

پرسشِ اہلِ گنہ روزِ جزا ہونے کو ہے

گرمیٔ بازارِ جنسِ ناروا ہونے کو ہے

اپنی بے صبری سے عکسِ مدعا ہونیکو ہے

آئینہ دار اثر دستِ دعا ہونیکو ہے

دل وہی دل ہے جو اس کا مبتلا ہونیکو ہے
جان ہے وہ جان جو اس پر فدا ہونیکو ہے

ایڑیوں تک دوش سے گیسو رسا ہونیکو ہے
بڑھتے ہی بڑھتے یہ افعی اژدہا ہونیکو ہے

قتل سے میرے پشیماں بے وفا ہونیکو ہے
اک ستم تو ہو چکا اب دوسرا ہونیکو ہے

گو سراپا مثلِ اخگر ہوں مرے کچھ غم نہیں
خاک ہو جانا مرا عقدہ کشا ہونیکو ہے

بزم میں ساغر کسی کے واسطے کوئی بھرے
میں سمجھتا ہوں کہ میری ہی صلا ہونیکو ہے

شان اُس کی دیکھ کر سمجھے تھے ہم روزِ الست
دولتِ کونین بے مانگے عطا ہونیکو ہے

کس طرح بازو پہ میں ڈھونڈ دوں دعائے چشم زخم
اوس کی سفاکی پہ شورِ مرحبا ہونیکو ہے

ہاتھ سے آئینہ جب رکھا تھا سمجھا تھا یہ میں
ہو چکا ہے تیز خنجر اب جفا ہونیکو ہے

سلسلہ جنبانِ وحشت ہے خیالِ خالِ رخ
دانۂ زنجیر کو نشو و نما ہونے کو ہے

یاس میں مجھ کو تسلی دے رہی ہے بیخودی
پردہ اب اُوٹھنے کو ہے اب تماشا ہونیکو ہے

چپکے چپکے ظلم کرنا چھپ نہیں سکنے کا اب
ناوکِ بیداد میں پیدا صدا ہونیکو ہے

فکر بے جا ہے منغّص کیجیے کیوں عیش کو
یہ تو ہے معلوم قسمت کا لکھا ہونیکو ہے

چل کے زنداں و گریباں کے ستم کی داد دو
مژدہ اے اہلِ جنوں محشر بپا ہونیکو ہے

آگیا ہے شرمِ عصیاں سے جو آنسو آنکھ میں
بہ کے رخساروں پہ دُرِّ بے بہا ہونیکو ہے

یہ نگارستانِ ہستی مظہرِ قدرت سہی
نقش ہو گر آبِ حیواں پر فنا ہونے کو ہے

ولہ ۱۸۱

لہر میں دریائے ہستی کی حباب آنیکو ہے
جو کوئی آنیکو ہے پا در رکاب آنیکو ہے

حسن کی آئینہ داری کو شباب آنیکو ہے
زلف میں بل گیسوؤں میں پیچ و تاب آنیکو ہے

مژدہ اے دل پھر ہوائے انقلاب آنیکو ہے
دورِ گردوں ہو چکا دورِ شراب آنیکو ہے

آنکھ میں تیری مروّت بھول کر آتی نہیں
شرم سو سو بار آنے کو حجاب آنیکو ہے

کہہ دیا بس۔ فال بد منہ سے نہ او واعظ نکال
مجھ پہ رحمت اُو تری گی تجھ پر عذاب آنیکو ہے

جا چکی تاب و تواں بس اب ہے اتنا انتظار
زندگانی کیطرف سے بھی جواب آنیکو ہے

پتلیاں پتھرا چلی ہیں کرتے کرتے انتظار
چارہ گر خوش ہیں کہ اب آنکھوں میں خواب آنیکو ہے

دیکھئے کیا رنگ ہو محفل کا اہلِ مصر کی
ہاتھ میں چھریاں ہیں یوسف بے نقاب آنیکو ہے

ہجر کی اک شب میں گھڑیاں بچ چکی ہیں دو ہزار
اے فلک سمجھوں گا میں روزِ حساب آنیکو ہے

سونے والو وقت آخر ہو گیا اب تو اٹھو

لے کے آئینہ لبِ بام آفتاب آنیکو ہے

شیشہ توبہ نہ جوشِ کشمکش میں ٹوٹ جائے

جھوم کر صحنِ گلستان میں سحاب آنیکو ہے

آگئی عارض پہ سرخی ہر طرح سے ہے ستم

یا حجاب آنیکو ہے یا اب عتاب آنیکو ہے

خانہ دل سے اوٹھائیں اپنا بستر صبر و ہوش

اس سرا میں کاروانِ اضطراب آنیکو ہے

جوشِ گل کی کشمکش میں آگیا سبزہ کو غش

شیشہ شبنم میں کھنچ کھنچ کر گلاب آنیکو ہے

نظم دیکھیں مصطفیٰ کا جانشیں ہوتا ہے کون

عرش سے مسجد میں حکمِ سدِ باب آنیکو ہے

۱۸۲ ولہ 16

جشنِ جم کا ماجرا بادِ صبا سے پوچھ لے

کیا ہوا تختِ سلیمانی ہوا سے پوچھ لے

داورِ حشر آرزوں کا نکلنا تو کجا

جان بھی مشکل سے نکلی ہے قضا سے پوچھ لے

کشتۂ تیغِ تغافل کی نہیں تجھ کو خبر

میں بتاؤں تجھ کو تو اپنی ادا سے پوچھ لے

پوچھتا کیا ہے کسی سے دل کو دل کی ہی خبر
سارا حال اس ساغرِ گیتی نما سے پوچھ لے

دو گواہوں سے پریشانی کا میری ہی ثبوت
گر تجھے باور نہیں زلفِ دوتا سے پوچھ لے

ہر قدم پر آتی ہے شہرِ خموشاں سے صدا
خاک میں ہم مل گئے ہیں نقشِ پا سے پوچھ لے

اے جنوں لے چل کسی جنگل میں ہے جوشِ بہار
راہ بجلی بن کے اس کالی گھٹا سے پوچھ لے

آگیا آتش قدم کہنے یہ تنہا اس قدر
جھوٹ کیا ہے شعلۂ رنگِ حنا سے پوچھ لے

لوٹنا بھی دل کا ظالم دیکھنے کی سیر ہے
آنکھ اوٹھانے کے لئے شرم و حیا سے پوچھ لے

زالِ دنیا کے فریب و مکر سے غافل ہے تو
بے وفائی اس کی مردانِ خدا سے پوچھ لے

جوشِ مستی میں نہ آشنا بے تحاشا نہ گذر
راہ میں آنکھیں بچھی ہیں نقشِ پا سے پوچھ لے

ہے زبانِ شمع خاموشی میں بھی صرفِ سخن
بزمِ ہستی کی خبر اہلِ فنا سے پوچھ لے
مفت کا چکر ہو گر پھرنا پڑے مثلِ ضمیر
دور کیوں جا تو خبر کو مبتدا سے پوچھ لے
منفعل ہو تو نہیں ہے اس کی رحمت میں کمی
چشمِ تر سے پوچھ لے دستِ دعا سے پوچھ لے
جس ہنر سے خود ہو عاری سیکھ لے اوستاد سے
راستہ جو بھول جائے رہنما سے پوچھ لے
پھر شکیبائی کا دعویٰ ہو چلا ہے نظمؔ کو
پھر مزاج آکر ذرا ناز و ادا سے پوچھ لے

۱۸۳

منزلوں کو عشق کی اہلِ جنوں سے پوچھیے
حال یہ یارانِ نجد و بے ستوں سے پوچھیے
دل کے خوں ہونے کی حالت اشکِ خوں پوچھیے
جان پر کیا بن گئی سوزِ دروں سے پوچھیے
آسماں سے کیجیے باتیں ذرا بن کر غبار
وجہ بربادی کی کچھ گردونِ دوں سے پوچھیے

سن سکیں گے آپ کیونکر دل کی بیتابی کا حال
پوچھیے لیکن ذرا صبر و سکوں سے پوچھیے

سرکشی کا دیکھیے سرو و صنوبر کی ثمر
جھومنے کی وجہ شاخِ سرنگوں سے پوچھیے

دہر ہے مانندِ قلزم آسمان مثلِ حباب
تھاہ کو پھر اس کی کیا گردونِ دوں سے پوچھیے

تا بلب آتا ہے نالہ اُڑن لیتا ہوا
وجہ بیتابی کی لذت ارغنوں سے پوچھیے

۱۴ ولہ ۱۰۳

عشق خط سے ہے سوا الفت لبِ خاموش کی
بڑھتی ہی رہتی ہے گرمی آتشِ خس پوش کی

ہم نے اس ساماں سے لی کوچۂ قاتل کی راہ
بارِ گردن سر کیا گردن وبال دوش کی

کاسۂ سر ٹھوکریں کھاتے ہوئے دیکھے وہیں
ہر قدم پر جس جگہ محفل تھی نا و نوش کی

خاک ان دہر کے چھٹنے کی پروا کچھ نہیں
تیرا دیوانہ یہ سمجھا گرد تھی پاپوش کی

قبر پہ آیا بھی تو شوخی سے باز آیا نہ وہ
شمع مدفن گاہ روشن کی کبھی خاموش کی

دیکھ کر پھولوں پہ شبنم ہے یہ مستوں کو گماں
رال ساغر پہ ٹپکتی ہے کسی مے نوش کی

کیا کمندِ زلف کم تھی قتلِ عالم کے لئے
اوس پہ یہ طرہ ہوا تلوار زیبِ دوش کی

رنج دینا اس قدر مجھ سے رہا دست و بغل
وسعتِ عالم ہوئی تنگی مری آغوش کی

مٹ نہ جائے آسماں اک دن گھروندے کی طرح
اشکِ غم میں شوخیاں ہیں طفلِ بازی کوش کی

احتمال اب تو مکاں کا لامکاں پہ ہو گیا
بڑھ گئی ہے اس قدر پرواز میرے ہوش کی

جاتے ہی منبر پہ واعظ آپ سے باہر نہ ہو
الحذر اے مہرباں کچھ حد بھی ہے اس جوش کی

خطِ ساغر دور سے ساغر کے نکلے کس طرح
یہ نگاہ مست ہے ساقی کسی مے نوش کی

ہے بجائے خود کمالِ شوق بھی مشکل

تنگ آنا یار کا تنگی ہوئی آغوش کی

آرزوئے دل کو سن سن کر یہ فرماتے ہیں وہ
جی میں کیا اے نظمؔ ہے باتیں کرو کچھ ہوش کی

۱۸۵ فاعلاتن فاعلاتن فاعلات ۱۴

کیا کہیں کیونکر تھمے کیونکر چلے
مضطرب آئے یہاں مضطر چلے

غیر کے گھر اس طرف ہو کر چلے
مفت کا احسان مجھ پر دھر چلے

ضعف میں بھی ہو گئی طے راہِ شوق
ہر جگہ گر گر اٹھے اٹھ کر چلے

کیا نگاہ آفت تھی کیا عشوہ تھا قہر
بزم میں چھریاں چلیں خنجر چلے

زیرِ گردوں زندگانی تھی پہاڑ
آفتیں جھیلیں مصیبت بھر چلے

ہو تواضع بھی مگر تمکیں کے ساتھ
چاہیے جھک کر ملے رک کر چلے

سندس و قاقم کی بھی پروا نہ کر
جب تک اپنا گیر و البتر چلے

کیا مزاجِ دہر کی اصلاح ہو
چار دن اپنی سی ہم بھی کر چلے

اُس کو بھی تیغ آزمائی کا ہے شوق
کیا ہوا اگر زخم میرے بھر چلے

ساقیا ہم سب ہیں رندِ پاکباز
جادۂ تسلیم پر ساغر چلے

خاک ہو جاؤں تو پہنچوں اوڑ کے کاش
کچھ تو میرا زور گردوں پر چلے

قبر میں گھٹ گھٹ کے یوں رہ جائیں ہم
ہائے یہ ٹھنڈی ہوا باہر چلے

وہ تو دل لیتے ہی بازی لے گیا
داؤں اپنا دیکھیے کیونکر چلے

کشتیٔ مے لے کے ساقی جلد آ
جھومتے دریا پہ ابرِ تر چلے

۱۸۶ ۲۱

تندیٔ مے حیرت افزا ہوگئی
موجِ برقِ طورِ سینا ہوگئی

جب زبانِ حال گویا ہوگئی
بات خاموشی میں پیدا ہوگئی

دل میں اٹھی تھی ابھی اک لہر سی
آنکھ تک پہنچی تو دریا ہوگئی

عیش کی رات اس قدر کوتاہ تھی
شامِ امشب صبحِ فردا ہوگئی

دب گیا گردِ کدورت میں جو دل
دفن ساتھ اُس کے تمنا ہوگئی

آتی ہے تارِ نفس سے یہ صدا
روحِ مرغِ رشتہ بر پا ہوگئی

ضبطِ گریہ مجھ کو راس آتا نہیں
پھر کھٹک آنکھوں میں پیدا ہوگئی

دل میں چپکے سے برا آیا خیال
اور خبر عالم میں افشا ہوگئی

پھر کچھ انساں کو نظر آتا نہیں
آنکھ جب محوِ تماشا ہوگئی

ہاتھ رکھتے ہی دلِ بیمار پر
مضطرب نبضِ مسیحا ہوگئی

کچھ نشاں تجھ کو ملا اے خاکِ جم
تیری دولت کس نے لی کیا ہوگئی

پیر زن کے کلبۂ تاریک سے
روشنیٔ طاقِ کسریٰ ہوگئی

چشمِ موسیٰ کو تھا ایسا شوقِ دید
اک نگہ برقِ تجلی ہوگئی

عشق کے اس شعبدہ کو دیکھنا
پھر جواں کیونکر زلیخا ہوگئی

دست و پا مارے کسی نے اب تو کیا
سر سے اونچی موجِ دریا ہوگئی

آگیا گلشن میں فرمانِ بہار — زلفِ سنبل خطِ طغرا ہو گئی

عشق بھی اک قوتِ اشرف ہے — دل سے دل میں راہ پیدا ہو گئی

دار پر کھینچو سزا اس کی یہ ہے — کیوں طبیعت ناشکیبا ہو گئی

دل میں تو نے جو چھپا رکھی ہے بات — وہ بھی چتون سے ہویدا ہو گئی

ہو گئی نانِ جویں سدِ رمق — لیجیے آباد دنیا ہو گئی

نظم کھینچا تو نے دنیا سے جو ہاتھ
دیکھ ہر نعمت مہیا ہو گئی

۱۸۲ — وله — ۱۳

سبحہ سے زنار کیوں کیسی کہی — زاہدِ عیار کیوں کیسی کہی

کٹ گئے اغیار کیوں کیسی کہی — چھا گئی ہر بار کیوں کیسی کہی

ہیں یہ سب اقرار جھوٹے یا نہیں — کیجیے اقرار کیوں کیسی کہی

روٹھنے سے آپ کا مطلب یہ ہے — اس کو آئے پیار کیوں کیسی کہی

کہہ دیا میں نے کہ ہے جھوٹھ موٹ — ہو گئے بیدار کیوں کیسی کہی

ایک تو کہتے ہیں صدہا پھبتیاں — اور پھر اصرار کیوں کیسی کہی

ناصحا یہ بحث دیوانوں کے ساتھ — عقل کی ہے مار کیوں کیسی کہی

کیا خفا بھی ہو ذرا سی بات پر — ہو گئی بوچھار کیوں کیسی کہی

مجھ سے بیعت کرلے تو بھی واعظا — ہاتھ لانا یار کیوں کیسی کہی

سرمہ دے کر دل کے لینے کا ہی قصد
آنکھ تو کر چار کیوں کیسی کہی

جان دیدے چل کے در پر یار کے
او دل بیمار کیوں کیسی کہی

کیا ہی بگڑے ہوتے ہی کی بات پر
ہو گئے بیزار کیوں کیسی کہی

اب تو حیدر اور ہی کچھ رنگ ہیں
مانتا ہوں یار کیوں کیسی کہی

۱۸۸ ——— فعلاتن فعلاتن فعلاتن فعلات ——— ۱۷

ہیچ نظروں میں اگر عالم فانی ہو جائے
پھر یہی ہیچ مدانی ہمہ دانی ہو جائے

کشتی بادہ میں پیدا وہ روانی ہو جائے
رنگ تیغ فلک آبی کبھی دھانی ہو جائے

کاش دل کش مری آشفتہ بیانی ہو جائے
درد دل تو نہ مرا اس کی کہانی ہو جائے

دل اگر رہرو اقلیم معانی ہو جائے
مرتفع بعد مکانی و زمانی ہو جائے

خسرو عشق نے تیشہ کو وہ عزت دی ہے
سر فرہاد پہ جو تاج کیانی ہو جائے

جوش میں آئے اگر دل جو ہے اک قطرۂ خوں
گرم ہنگامۂ خونابہ فشانی ہو جائے

جائے عبرت ہے کہ یوں کوچ کرے لشکر گل
جرس قافلہ اک برگ خزانی ہو جائے

اک ذرا تشنگی شوق میں تاثیر ہے شرط
پھر جو پتھر کی طرف دیکھیے پانی ہو جائے

کبھی مرنے کا ہے ذکر کبھی حشر کا ذکر
پاس واعظ کے جو بیٹھے خفقانی ہو جائے

دہن زخم ہے سوتوں کے لئے ہے دعا
کہ زیادہ تیرے خنجر کی روانی ہو جائے

شکوہ ہجر جو کرتا ہوں تو ملتا ہے جواب
صبح ہو جلد ہمیں ختم کہانی ہو جائے

کس قدر جوش ہے واعظ کہیں ایسا تو نہ ہو
صرف رندوں ہی پہ زورِ ہمہ دانی ہو جائے

گوہرِ پند کجا اور کجا ناشنوا
دیکھ پتھر نہ سماعت کی گرانی ہو جائے

رشتہ در رشتہ جو ہو طولِ امل لطف ہو جب
صید اس دام میں طاؤسِ جوانی ہو جائے

چمنستاں میں عنادل کا ہوا ایسا تو ہجوم
شاخِ گل جو ہو وہ ارگن کی کمانی ہو جائے

ہاتھ میں لے کے عصا طور پہ آئے ہیں کلیم
آشکارا نہ کہیں حالِ شبانی ہو جائے

راہِ مولیٰ میں اگر نظم کو آجائے اجل
گردِ صحرائے نجف بردِ یمانی ہو جائے

۱۸۹ ۱۲

وہ جو برہم ہیں تو بگڑی ہوئی تدبیر بھی ہے
مستعد لڑنے پہ مجھ سے مری تقدیر بھی ہے

دیکھیں اب ملتی ہے کیا داد ہمیں محشر میں
دل بھی قاتل بھی ہے پیکاں بھی ہے تیر بھی ہے

چاہے وہ قتل کرے چاہے مجھے قید کرے
سر بھی شمشیر بھی ہے پاؤں بھی زنجیر بھی ہے

منہ سے شکوہ تو میں کرتا نہیں خود دیکھ لیں آپ
دل میں اک زخم بھی ہے زخم میں اک تیر بھی ہے

دلِ مضطر کی اسیری کے ہیں ساماں کیا کیا
زلف و کاکل بھی ہے گیسوئے گرہ گیر بھی ہے

خونِ ناحق کو بھلا حشر میں مکرے تو سہی
تیغ و صیاد بھی فتراک بھی نخچیر بھی ہے

کس کو دیتا ہے خدا فتح و ظفر کس کو شکست
دیکھنا بختِ جواں بھی فلکِ پیر بھی ہے

ہم نے ان زہد فروشوں کو بہت دیکھا ہے
کچھ حقیقت بھی ہے کچھ حیلہ و تزویر بھی ہے

لے چلے جان اشارے مژہ و ابرو کے
کشتۂ تیغ بھی ہے دل ہدفِ تیر بھی ہے

آئینہ رکھ کے ہی منظور اسے آرائش بھی
اسی پردہ میں مگر قتل کی تدبیر بھی ہے

نہیں کھلتا سبب غفلت اہل عالم
نہیں معلوم کچھ اس خواب کی تعبیر بھی ہے

چاہ کر تم کو گنہ گار رہوا نظم حزیں
قابل قتل بھی ہے لائق تعزیر بھی ہے

۱۹۰ ۱٦

لے کے ساغر سر و پا کا نہ رہا ہوش مجھے
کردیا فکر دو عالم سے سبکدوش مجھے

ہو گیا دام کا خطرہ بھی فراموش مجھے
طبع رنگیں نے نہ رہنے دیا خاموش مجھے

میں نے کہتے ہوئے کعبہ کو سنا ہے اکثر
کردیا ہے غم عالم نے سیہ پوش مجھے

بزم عشرت میں جو آجائے وہ مست اے ساقی
میں سنبھالوں اسے اتنا تو رہے ہوش مجھے

کہہ رہا ہے یہی نقش خط پیمانۂ جم
پی گئے گھول کے رندان قدح نوش مجھے

کھول کر میں گرہ زلف پشیمان ہوا
نظر آیا وہ ستم گار زرہ پوش مجھے

عہد پیری میں ہوں وہ شمع مزار حسرت
کہ نسیم سحری کر گئی خاموش مجھے

دیدۂ تا دل ہے بھر آج کہہ حیرانی
ہائے ای پیر مغاں آگیا پھر ہوش مجھے

ہو جو ممکن تو رگ جاں میں گرہ دے رکھوں
کہ تیری یاد نہ ہو جائے فراموش مجھے

عیش کی عمر ہے کوتاہ نہیں شک اس میں
شب گیسو میں ہوئی صبح بناگوش مجھے

خوف یہ ہے نہ کہیں وار اجل کا چل جائے
جھریاں کہتی ہیں پیری میں زرہ پوش مجھے

الفت مادری آخر تھی زمیں کو مجھ سے
کس محبت سے لیا کھول کے آغوش مجھے

اس کی رحمت کے ہیں صدقے کہ دیا زاہد   دل افسردہ تجھے خاطر پر جوش مجھے
بادشاہی بھی گدائی درِ میخانہ کی   کہ سلیماں کی طرح لیکے اوڑا ہوش مجھے
نقش حسرت ہوں کسی نے نہ کیا پیش چشم   حرف عبرت ہوں بنایا نہ درِ گوش مجھے

پرسشِ حشر سے اے نظم بچا لے گی ضرور
اوس کی درگاہ عطا پاش و خطا پوش مجھے

۱۹۱   ۵

دیکھے وہ زلف کمر یا قد رعنا دیکھے   جس کے آگے تو خرامان ہو وہ کیا کیا دیکھے
کس کو وہ دیکھے ترا جو رخ زیبا دیکھے   چاند یہ دیکھ کے پھر منہ نہ کسی کا دیکھے
کوئی کب تک ناز و ادا کا تماشا دیکھے   روٹھ جانا ترا دیکھے کہ مچلنا دیکھے
خیر ناصح ہی اگر سحر بیاں ہووے وو   میں سمجھنے کا نہیں وہ مجھے سمجھا دیکھے
شکوہ ظالم کا زباں سے تو نہیں کرنے کا   میں دکھاؤں جو کوئی میرا کلیجا دیکھے
دیر سے جو رہی ساغر بکف و عشوہ نما   آنکھ جس نے تری دیکھی ہو ادھر کیا دیکھے
میری بیتابی دل کی ہو اوسے نہیں کیا پروا   جن نگاہوں نے دو عالم تہ و بالا دیکھے
شام ہی سے غم فرقت میں ہے مر رہنا خوب   کیوں جیے اتنا جو طول شب یلدا دیکھے
تھا کرشمہ یہ شب عیش کی کوتاہی کا   صبح اور شام کو یوں کوئی یکجا دیکھے
بدمزاجی کی بھی کچھ حد ہے الٰہی توبہ   چھیڑ دے کوئی ذرا اور تماشا دیکھے
زاہد خشک کو دعوی ہے شکیبائی کا   سامنے اس بت کافر کے ذرا آ دیکھے

جس کو منظور رسائی ہو ترے کوچہ تک
کچھ دنوں کھائے ہوا دشت کی صحرا دیکھے

ہو جسے مثلِ حباب ایک نگہ کی فرصت
کھول کر آنکھ کو جاتی ہوئی دنیا دیکھے

چاہیے دہر میں وہ عاقبت اندیش نظر
جو کہ امروز کو آبستنِ فردا دیکھے

جوشِ گریہ ہے علاجِ غمِ دیوانۂ عشق
دل سنبھل جائے جو بہتا ہوا دریا دیکھے

۱۹۲ —— وله —— ۲۱

جلوۂ کن فیکوں ہے ترے فرمانے سے
کیا کمی ہو گئی تمنا مری بر لانے سے

سرکشی نفس کی ہے باعثِ بیتابیِ دل
لہر پیدا یہ ہوئی سانپ کے بل کھانے سے

آنکھ تھی محوِ تماشا کہ گری اک بجلی
برق پیدا یہ ہوئی دل کے تڑپ جانے سے

عقدۂ سرِ حقیقت نہ ہوا حل اب تک
گتھیاں اور بھی پڑتی گئیں سلجھانے سے

قیدِ ہستی گرہِ سلسلۂ تارِ نفس
زندگی ہوتی ہے زنجیر کے کھڑکانے سے

رو لے جی بھر کے پہاڑوں سے نکل کر اے ابر
فائدہ کیا سرِ شوریدہ کے ٹکرانے سے

تو نے دوزخ میں گرایا مجھے اے نفسِ زبوں
شعلے اٹھنے لگے آخر ترے بھڑکانے سے

دیکھ کر جلوۂ جاناں میں ہوا گم ایسا
آپ کو پا نہ سکا آپ میں بھی آنے سے

چشمِ بینا کو نظر آتے ہیں اسرارِ نہاں
پردۂ ابر میں بجلی کے چمک جانے سے

سارا عالم مری نظروں میں ہے خورشید نشاں
ذروں میں مہر کی تصویر اتر آنے سے

دیکھ اک کوٹھری کاجل کی ہے دنیائے دنی
لے نجاتِ ابدی بچ کے نکل جانے سے

زیست کا لطف گیا ساتھ دلِ زندہ کے
جل گیا نخل بھی اس پھول کے کمھلانے سے

دے چکا بندے کو اذن وجہاد وہ پہلے
اصل قیمت کو سمجھ لیجئے بہ جانے سے

اپنی دنیا تو بنا لی تھی ریاکاروں نے
مل گیا خلد بھی اللہ کو بہلانے سے

داورِ حشر گنہگاروں سے پرسش کیسی
فائدہ قصۂ پارینہ کے دہرانے سے

اوس طرف عرش کے ہی منزلِ مقصود اپنی
رہ گیا میں کششِ ارض میں آجانے سے

دیکھ لی دیکھ لی نیت تری ہم نے ساقی
بادہ کم ہو تو نہ کچھ جام کے چھلکانے سے

آگے تو منہ یہاں کام نہیں ناصح کا
میں سمجھ جاؤں گا نہ کچھ ترے سمجھانے سے

کرسیٔ عدل کی اصغر نے بڑھا دی توقیر
داوری گاہ عدالت میں جگہ پانے سے

اوج پہ مجلسِ اعلیٰ کی سفارش سے ملا
اور سلطانِ حق آگاہ کے فرمانے سے

داد لیتا ہوں مرے نظم نوا سنجی کی
ابر کے جھومنے سے بحر کے لہرانے سے

۱۹۳

یاد ہیں ہم کو بہت ذکر پرستانوں کے
سننے والے نہ رہے اب تو ان افسانوں کے

مسکرانے سے چھلکتے ہوئے پیمانوں کے
بزم میں کھلنے لگے پھول بھی گلدانوں کے

گرد میں قافلۂ نکہتِ گل کی سمجھا
دیکھ کر رنگ پریدہ کو گلستانوں کے

آتش افروز ہوئی برقِ صدائے مطرب
نغمہ نے نہیں شعلے میں شبستانوں کے

بارِ خاطر تو نہ ہو جا کہیں اے طولِ امل
پس نہ جاؤں میں کہیں بوجھ سے ارمانوں کے

تیلیوں کا یہ تماشا تھا جو دیکھا ہم نے
ہاتھ پہ دے کے میں مارے سلسلہ جنبانوں کے

لذتِ نغمہ سے ہوتی نہیں زحمت محسوس
ناقہ چلتا ہے ترنم پہ حدی خوانوں کے

بسملوں کو بھی تڑپتے نہیں دیکھا ایسا
چاندنی شمع کی مقتل میں ہے پروانوں کے

لے چل اے جذبۂ دل آنکھ بچا کر مجھ کو
پہرے بیٹھے ہوئے رہ جائیں نگہبانوں کے

ڈال دی ہالۂ پردر دنے اون پر بھی کمند
کنگرے عرش سے اونچے تھے جن ایوانوں کے

ہیں حوادث بھی زمانہ کے وہ اعجاز رقم
نقش رہ جاتے ہیں ہر نخل میں طوفانوں کے

نکل آشوب سے اس ہفت فلک کے بچ کر
کچھ بگولے ہیں سرِ راہ بیابانوں کے

آزمانے کو جو ابنائے زمانہ کی پہ چلا
دیو بھی مجھ کو ملے بھیس میں انسانوں کے

ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے ہیں اربابِ کمال
حوصلے اور بڑھے جاتے ہیں نادانوں کے

خوانِ نعمت پہ ہجوم اہلِ ہوس کا ہے عبث
من و سلویٰ نہیں حصہ میں مگس رانوں کے

بحر موجوں سے گلا اپنا چھڑا کر نکلا
رہ گئے دام جو بچھے تھے گریبانوں کے

جلد اے بادِ مراد آکہ ہے کشتی اپنی
منہ میں گرداب کے آشوب ہیں طوفانوں کے

کتنے معمورۂ عالم تھے کہ اب ان کی جگہ
خاک ہی خاک ہے دامن میں بیابانوں کے

اوس کی محفل میں خبر کچھ دلِ مضطر کی نہیں
لوٹتے ساتھ ابھی دیکھا تھا ارمانوں کے

مجھ کو حیرت ہے کہ رخسار تو لو دیتے ہیں
اور کھلاتے نہیں پھول کبھی کانوں کے

ہم نے بھی گوشۂ عزلت میں کیے ہیں کام
کارنامے جو تہمتن کے ہیں میدانوں کے

ایسے دروازہ کو بس دور سے ہی اپنا سلام
جس جگہ ناز اٹھانے پڑیں دربانوں کے

ہیبتِ معدلتِ دولتِ عثمانی نے
شیر میں لرزہ بر اندام نیستانوں کے

چاہیے عرش کے مضمون غزل میں نظم
ساتھ ہی اس کے مضامین پریشانوں کے

۱۹۴

مجھ کو اے یار ذرا چشم نمائی ہوتی
دل تو مل جاتا جو آنکھوں میں لڑائی ہوتی

دے کے مے پیر مغاں نے مجھے روکا ورنہ
داو پر دولت کونین لگائی ہوتی

راز سے دل کے نہ کرتا جو زباں کو آگاہ
بات جو اپنی تھی کاہکو پرائی ہوتی

دل سے حسرت کا نکلنا تھا اگر ناممکن
ساتھ لیتی ہوئی دل کو نکل آئی ہوتی

سامنے داور محشر کے بگڑتے پھر آپ
پہلے مجھ سے تو ذرا آنکھ ملائی ہوتی

ضبط بیتابی دل سے جو بنایا تھا حصار
ایک آنسو نے وہ دیوار گرائی ہوتی

ہو تپ رشک میں جس طرح قفس میں بلبل
یہیں رہ جاتا تڑپ کر جو رہائی ہوتی

کوئی تدبیر جو بنتی تو بگڑ بیٹھتے
کبھی تقدیر جو لڑتی تو لڑائی ہوتی

ٹوٹ جاتی جو یہ زنجیر تو اے دشت جنوں
شیر سے وادی وحشت میں کلائی ہوتی

توبہ جب کر چکے ہم ابر آیا بھی تو کیا
لطف جب تھا کہ گھٹا آنکھوں میں چھائی ہوتی

وضع ہم خانہ بدوشوں کی بنا کر اے خضر
چھاونی عالم فانی میں یہ چھائی ہوتی

اوج عزت سے گراتی نہ اگر حرص مجھے
آسماں کو ہوس ناصیہ سائی ہوتی

رشک خوئے رگ سنگ کا خمیر ہوئی یہ ورنہ
اس پتنگے نے ابھی آگ لگائی ہوتی

دل کے ارمان اگر تھے نہ نکلنے والے
دم نکلنے کی تو امید بر آئی ہوتی

حسن جو ہوتا ہے بندش میں وہ مضموں ہے کہاں
بڑھ کی ہونے سے جو قیمت میں گھٹائی ہوتی

کاغذ ہاد رہا دست ہوس میں دل زار
پارا ہو جاتا یہ ممکن جو چھڑائی ہوتی

گر پڑا پاؤں پہ کوئی تو کہا ٹھکرا کر
لوگ بیٹھے تھے ذرا شرم تو آئی ہوتی

تو نے احسان جو اٹھایا تھا کسی کا اے نظم
آنکھ پھر سامنے اس کے نہ اٹھائی ہوتی

۱۹۵ ولہ ۱۲

جان جاتی رہے شکوہ نہیں کرنے والے
کیا جگر رکھتے ہیں دم عشق کا بھرنے والے

پھیر تو لی ہے نگہ اس کی خبر ہی کہ نہیں
مل گئے خاک میں نظروں سے اترنے والے

مضطرب ہو نہ شب غم میں ستاروں تو تجھے
کیسے خاموش گذرتے ہیں گذرنے والے

روح یہ ہو گئیں تن بیجاں میں کچھ آساں نہیں
کیا مسیحا بھی ہیں دم عشق کا بھرنے والے

کوئی موسیٰ کی طرح طالب دیدار تو ہو
اپنے عاشق سے وہ پردہ نہیں کرنے والے

آفتوں کا ہے یہ گھر دم بھی نہ لینے کو ٹھہر
اتنا وقفہ بھی مناسب نہیں مرنے والے

ایسے بیزار گئے لوگ جو دنیا سے گئے
اب ادھر بھول کے بھی رخ نہیں کرنے والے

نصرت حق جنہیں موسیٰ کی طرح ہے منظور
کسی فرعون سے ہرگز نہیں ڈرنے والے

طالب منزل مقصد ہے مرا مشت غبار
ساتھ لے لے مجھے رستہ سے گذرنے والے

موج خیز غم الفت کا تلاطم تو یہ
غوطے کھا جاتے ہیں پانی پہ ٹھہرنے والے

خون ناحق کہیں چھپ سکتا ہے کچھ دیکھ تم
حشر کے دن تو مکر جائیں مکرنے والے

زیست ذلت کی ہو مر جانے سے بدتر بخدا
کچھ خبر بھی ہے تجھے موت سے ڈرنے والے

ولہ

۱۹۶ — ۱۲

شمع خورشید ہی اس بزم میں جلنے کیلئے
چرخ گرگٹ کی طرح رنگ بدلنے کیلئے

غم ہے بے صبر کلیجہ مرا ملنے کیلئے
اشک بیتاب ہیں آنکھوں سے نکلنے کے لیے

پاؤں بہکا تھا گزشتہ میں بہکی نہ زباں
آہ ساقی کا لیا گر کے سنبھلنے کیلئے

موت ہی نے شب ہجراں میں بہت کی تاخیر
ہم تو بیٹھے تھے بڑی دیر سے چلنے کیلئے

اتنا اطلس کی قبا پر نہ ہو نازاں طاؤس
ہائے نازک بھی تو ہوں ناز سے چلنے کیلئے

یہ سمجھ کر سر رہ ہم نے بنایا ہے مزار
تم کبھی تو نکل آؤ گے ٹہلنے کیلئے

سہہ کے ایذا دل نازک کو بنایا پتھر
کاش آئے گا یہ موذی کو کچلنے کیلئے

دل لگایا ہے تو آنسو نہ بہاؤں کیونکر
نخل کو سینچتے ہیں پھولنے پھلنے کیلئے

پوچھے دشمن سے کوئی میرے قلم کا انداز
ہے یہ مار دو زباں زہر اگلنے کیلئے

دل ہو بیتاب تو یارب رہے طاقت مجھ میں
دونوں ہاتھوں سے کلیجے کو مسلنے کیلئے

دامن یار تلک ہاتھ نہ پہنچا نہ سہی
دل تو پہلو میں ہے سو ہاتھ اچھلنے کیلئے

ہے یہ بالوں کی سفیدی خبر مرگ اے نظم
دھوپ دیوار پہ چڑھتی ہے تو ڈھلنے کیلئے

ولہ

۱۹۷ — ۱۱

کہنیوں تک مرے بہہ بہ کے لہو آتا ہے
کیا نہیں آتا ہے کافر کو وضو آتا ہے

اوس کو جو کوٹھی پہ دیکھا ہی تو ہی دل کا یہ حال
جب اوچھلتا ہے لب بام کو چھو آتا ہے

نشۂ مئی سے ہے لغزش قدم ساقی میں
جھونکے لیتا ہوا محفل میں سبو آتا ہے

کوئی پوچھے تو سہی قتل کیا ہے کس کو
منہ چھپائے ہوئے وہ عربدہ جو آتا ہے

قبر میں بہر خدا چین سے سوون کہ نہیں
ہے ستم ساتھ جنازہ کی بھی تو آتا ہے

ہیں کدھر رند ذرا جھوم کے چلنا دیکھیں
ابر کہسار سے اوٹھ کر لب جو آتا ہے

بس نہ دیوانے پہ چلتا ہے نہ ہشیار پہ کچھ
نہ تو دل آتا ہے قابو میں نہ تو آتا ہے

کھل گیا تو کہ دل میں ہے خلش مژگاں کی
خون اشکوں میں بقدر سر مو آتا ہے

زمزمہ تیرا کس آفت کا تھا اے مرغ چمن
آج گلزار میں غنچے کے لہو آتا ہے

لاش بسمل پہ جو ہے مشک فشانی منظور
بال کھولے ہوئے وہ غالیہ مو آتا ہے

نظم اغیار سے کیا قدر شناسی کی امید
کہیں ناکس کو خیال کس و کو آتا ہے

۱۹۸ —— ولہ —— ۳۲

نہ مروت نہ مدارا نہ وفا آتی ہے
ظلم آتا ہے ستمگر کو جفا آتی ہے

مژدۂ عیش لیئے باد صبا آتی ہے
ساغر گل میں مئے ہوش ربا آتی ہے

اونگلیاں کانوں میں رکھئے تو صدا آتی ہے
شور کرتی ہوئی اک سیل فنا آتی ہے

رات دن قافلۂ عمر ہے سرگرم سفر
دل دھڑکتا ہی تو آواز درا آتی ہے

شک گذرتا ہے بطے کی طہارت میں اگر
ایک غوطہ خم صہبا میں لگا آتی ہے

لہ اس بیت کا مضمون (۲) معرفت کے قمار سے ماخوذ ہے

گل نے کیا جانے سنا ہی کسی آواز — کان بجتے ہیں ابھی تک وہ صدا آتی ہے

اے صبا سیرِ گلستاں ہے تو مستانہ روی — تو قریبِ گلِ نسریں کی لپٹ آتی ہے

موسمِ گل ہیں یہ جامہ میں سمانا مشکل — ٹھیک آتا ہے گریباں نہ قبا آتی ہے

شنوا ہو تو کوئی شوق تو ہو منزل کا — سیکڑوں کوس سے آوازِ درا آتی ہے

دشتِ غربت سے طبیعت کا جو ہوتا ہے خیال — سامنے حیرتِ نقشِ کفِ پا آتی ہے

منزلِ گور ہے اس دشت کی پہلی منزل — دل کے آ جانے سے پہلے ہی قضا آتی ہے

دم جو لیتا ہے ذرا کوہ کنی میں فرہاد — جا کے شیریں اُسے آواز سنا آتی ہے

خلوتِ وصل میں آئینہ کا ہو حیرت کس کو — آتی ہے شرم بھی تو روبقفا آتی ہے

اس کا دم بھرتے ہیں بیٹھے ہوئے دنیا سے الگ — ہر نفس میں خبرِ ارض و سما آتی ہے

خود تو مخمور ہے اوروں کو نصیحت زاہد — کچھ تجھے شرم بھی اے مردِ خدا آتی ہے

لطف جب ہے کہ برسنے لگے میخانہ پر — جھومتی قبلہ سے گھنگور گھٹا آتی ہے

کیا عجب ہے کہ صراحی بھی کرے سجدۂ شکر — جھومتی قبلہ سے گھنگور گھٹا آتی ہے

وہ چلا گورِ غریباں کو خدا خیر کرے — تو قیامت بسرِ خاکِ شہدا آتی ہے

دل سے باتیں شبِ فرقت میں رہیں صبح تلک — اس کہانی میں کہیں نیند بھلا آتی ہے

آہ کے ساتھ نکلتا ہی جو کچھ دل کا غبار — جا کے گردوں پہ بھی وہ خاک اُڑا آتی ہے

نہ تھمی عمرِ رواں لاکھ پکڑتا رہا دل — سچ کہا ہے کہیں مٹھی میں ہوا آتی ہے

رحمتیں وادیِ غربت میں بھی تو نے بخشیں — چھاؤں ہے سبزہ ہے جنگل کی ہوا آتی ہے

آنکھ جب پڑتی ہی دنیا پہ تو بڑھتی ہے ہوس
جب دریچہ کوئی کھلتا ہے ہوا آتی ہے

ہائے یہ قبر کی گرمی یہ اندھیرا ہے ہے
کوئی کھلتا ہی نہ روزن نہ ہوا آتی ہے

کچھ دنوں تختِ سلیماں تھا ہوا پر اب تو
خاک اڑانے کو سلیماں کی ہوا آتی ہے

خاک میری ہوئی برباد تو ہو جانے دے
میں تو خوش ہوں ترے دامن کی ہوا آتی ہے

ہاتھ باندھے ہوئے آئینہ کھڑا رہتا ہے
پاؤں پڑنے کے لئے آپ حنا آتی ہے

چھیڑ کرتا ہی یہ ابرو کہ پڑے گی تلوار
کہہ رہا ہے یہی گیسو کہ بلا آتی ہے

وصل کی رات بھی رہتی ہی لڑائی اکثر
بار ہا بیچ میں وہ زلفِ دوتا آتی ہے

تیوری چڑھ جاتی ہی فوراً یہ تماشا دیکھو
فتنوں سے جو ہنسی اوس کو ذرا آتی ہے

چاند نکلا کرے بڑھ بڑھ کے نکلتا ہو اگر
کہیں اوس میں ترے عارض کی صفا آتی ہے

نظمِ آزاد ہے اب در کنجِ خلوت
یا درِ صرصر نہ جہاں بادِ صبا آتی ہے

۱۹۹ ——— ولہ ——— ۲۱

پاک کر اشک نہ اے شاہدِ خوش خو میرے
ہاتھ نازک ہیں ترے گرم ہیں آنسو میرے

ناصحا رونے سے آزردہ رہا تو میرے
رو کے تسکیں نہ پونچھے کبھی آنسو میرے

برچھیاں مار گئی اور دِ جگر چاک نہ کر
پردہ دارِ حرمِ شوق میں پہلو میرے

عہدِ طفلی سے جو ہیں سر یہ بلا میں نازل
جانتا ہوں کہ یہ لٹکے ہیں گیسو میرے

درد و اندوہ سے پڑتی ہی رہی چین و شکن
غم کے ہاتھوں میں کیا دمار ہے ابرو میرے

ہاتھ سے ہائے میرے اشک گئے پاک اُس نے / لچھیاں موتیوں کی ہو گئے آنسو میرے

پاؤں جھولے سے نکالے تھے کہ سودا لپٹا / عشق پیچاں کے شگوفے ہوئے گھنگرو میرے

اوس طرف لی کبھی کروٹ تو کبھی اُس جانب / ڈھونڈتے ہیں کسی محبوب کو پہلو میرے

ہیں گلے میں جو کسی مہر لقا کے بانہیں / آج شاخ گل خورشید ہیں بازو میرے

جیب میں جا بنوں کہ ہوئی یکدلی و ہمدردی / اون کی آنکھوں سے نکلنے لگیں آنسو میرے

جب بڑھی دست دعا جانب ساقی ازل / بھر گئے بادۂ مقصود سے چلو میرے

جان پہچان نہیں گوشۂ غربت میں کوئی / روشناسوں میں ہیں آئینہ زانو میرے

دل کو بولے تو مرے حسرت دیدار ذرا / روشنی طور کی دیں سنگ ترازو میرے

آگیا حال مجھے حضرت موسیٰ کی طرح / آکے چمکا جو کبھی سامنے جگنو میرے

آج پر جوش ہے پر شور ہے بیتابی دل / یہ سبب ہے کہ تلاطم میں ہیں آنسو میرے

شب غم سے کسی کروٹ نہیں پایا آرام / شکل فانوس خیالی ہے پہلو میرے

کف افسوس ہی مل مل کے گیا کام تمام / خون امید سے لبریز ہیں چلو میرے

ہاتھ ہی کیا گرہ زلف جو کھل جائے گا / کوئی مضموں ہیں کہ بندھ جائیں گے بازو میرے

دیکھ کر تاروں کو یاد آتی ہے بزم شب عیش / صبح تک شام سے تھمتے نہیں آنسو میرے

کیا بیان کیجیے بالوں کی سفیدی کا فروغ / عہد پیری میں ہوئے نوے ابرو میرے

تخلص اس بزم میں میں شاعر صاحب دل ہوں
دل سے خالی نہیں مصرع کی بھی پہلو میرے

رنگ خون اشک میں گہرا نظر آتا ہی مجھے
آج دامن پہ کلیجا نظر آتا ہے مجھے

پر خطر عشق کا صحرا نظر آتا ہی مجھے
خضر اس دشت میں پیاسا نظر آتا ہی مجھے

بندہ اوس زلف میں اولجھا نظر آتا ہی مجھے
دہن یار کا چھالا نظر آتا ہی مجھے

نظر عاقبت اندیش اک آئینہ ہے
شکل امروز میں فردا نظر آتا ہی مجھے

نہ فلک دیکھ سکا ایسہ کمال وہ فروغ
ترا منہ صبح سے اترا نظر آتا ہے مجھے

زال و سیمرغ کا مذکور اک افسانہ ہے
دوست اس عہد میں عنقا نظر آتا ہی مجھے

نہ خیال کیا ہو میں اوٹھانہ بر انداز حجاب
اب تو پردہ ترا گہرا نظر آتا ہے مجھے

اس کی رحمت کا ہی جوش اپنی گناہوں کا ہجوم
ایک سیلاب دریا نظر آتا ہے مجھے

کچھ عجب حال ہے دیکھی ہی اوسکی تصویر
نہ اندھیرا نہ اوجالا نظر آتا ہے مجھے

کشتی بادہ لگا دے لب جو اے ساقی
آج کے ابر میں دریا نظر آتا ہے مجھے

غیر آنکھوں میں اوڑا لے گیا نقشہ تیرا
جب سے چہرہ بھی کچھ اترا نظر آتا ہے مجھے

ساغر مے کے سوا اور نہیں اس کا علاج
دل قتیل غم فردا نظر آتا ہی مجھے

آج وہ اوڑھ کے انگیا میں دوپٹہ آئی
آسماں رنگ بدلتا نظر آتا ہی مجھے

بیخودی کو مری کافی ہی ہے اے موسی
کوہ پر لالہ حمرا نظر آتا ہے مجھے

جستجو میں تری او دشت میں پھرتا ہوں میں
گہ فلک آبلہ پا نظر آتا ہے مجھے

چشم و مژگاں کا تصور ہی جنوں کا ساماں
ان جہروں کوں ہی تو صحرا نظر آتا ہے مجھے

بند کی دیدۂ عشاق نے پری خفتہ میں
ایک آفت کا یہ پتلا نظر آتا ہے مجھے

سن نہ لے وہ نفسِ بازپسیں کی آواز
جان دینے میں بھی کھٹکا نظر آتا ہے مجھے

درِ مقصود کا کیا خوب شگوں ہاتھ آیا
کفِ افسوس میں چھلا نظر آتا ہے مجھے

دعوی جوشِ صفا اور تمہارے آگے
آئینہ آنکھ کا اندھا نظر آتا ہے مجھے

حسرتِ دید سے جان آ جو گئی آنکھوں میں
دم نکلنے کا تماشا نظر آتا ہے مجھے

داغ کو کیوں نہ کلیجے سے لگائے رکھوں
ایک دل سوز تو اپنا نظر آتا ہے مجھے

اے غمِ یار لہو مہر سکھانے والے
دل میں کچھ خون تمنا نظر آتا ہے مجھے

شہرہ ہی شہرہ ہے ہستی کا یہاں نام ہی نام
بیضۂ چرخ میں عنقا نظر آتا ہے مجھے

جس جگہ مہرِ نبوت نے شرف پایا ہے
آپ کا نقشِ کفِ پا نظر آتا ہے مجھے

ناز انداز ستم عشوہ کرشمہ حیدر
جو ہے وہ خون کا پیاسا نظر آتا ہے مجھے

۱۰۳ —— فعلاتن فعلاتن فعلاتن —— ۱۲

حسن پر خلقِ خدا لوٹ گئی
وہ ادا کی کہ قضا لوٹ گئی

حال پر اس کی قیامت اٹھ کر
مثلِ نقشِ کفِ پا لوٹ گئی

درد کی طرح اٹھا میرا غبار
دو قدم چل کے ہوا لوٹ گئی

سیکھے ہم سے کوئی اندازِ سوال
عرش پر جا کے دعا لوٹ گئی

بعد میرے کوئی پرساں نہ ہوا
قبر پر آ کے وفا لوٹ گئی

دیکھنا وار ادا کا اوس کی | ساتھ بسمل کے قضا لوٹ گئی
وہ جو مستانہ چمن سے گذرا | شاخ گل موج صبا لوٹ گئی
دیکھنا جذب دل زار مرا | کشمش کا ہربا لوٹ گئی
واہ رے حسن یہ دوش و کمر | دیکھ کر زلف دوتا لوٹ گئی
چھاؤں آئی تیرے کوچہ میں کہ دھوپ | خاک پر مثل ہما لوٹ گئی
چاندنی تا سر دیوار آکر | دیکھ کر جوش صفا لوٹ گئی

آج سن کر تیرے نالے اے نظم
بلبل نغمہ سرا لوٹ گئی

۲۰۲ مفاعلن فاعلن فعولن دوبار ۲۲

خبر ہوئی خود بخود یہ دل کو دہر دارالاماں نہیں ہے
خوشی یہ کہہ کر ہوئی روانہ مرا ٹھکانہ یہاں نہیں ہے
وہ عندلیب اسیر ہوں میں حبسی کہ اذن فغاں نہیں ہے
قفس میں نقش و نگار کیا ہوں نفس ابھی خوں چکاں نہیں ہے
کبھی نہ کیں جس نے دل سے باتیں کہ یہ مرا رازداں نہیں ہے
نہ حرف مطلب زباں تک آیا کہ یہ مری ہمزباں نہیں ہے
بیاں سے جانے کا نام آنا فریب میں دیکھ آنہ جانا
طلسم ہے رہ گزار ہستی غبار ہے کارواں نہیں ہے

نہ جذب وہ کہربا میں پایا نہ رنگ وہ کیمیا میں پایا
کہاں کہاں میں نے جا کے ڈھونڈا دل و جگر کا نشاں نہیں ہے

نہ جانے ضبطِ فغاں نے کیونکر غمِ دروں کو چھپا کے رکھا
حریرِ رنگِ پریدہ میں تو کہیں وہ شعلہ نہاں نہیں ہے

ادھر جوانی کی شام آئی ادھر ہوئی صبحِ عہدِ پیری
یہ کیسی شام و سحر الٰہی کہ جس میں شب درمیاں نہیں ہے

نہ کوئی اعلیٰ نہ کوئی ادنیٰ کہ ہے مساوات ناگزیر
جہاں کہ ہم سب ہیں رہنے والے زمیں نہیں آسماں نہیں ہے

اگرچہ ہے بے ثباتِ عالم ٹھہر کوئی دم تو اور شبنم
ترا قدم تو سبک ہے ایسا کہ برگِ گل پر گراں نہیں ہے

کمندِ فکرِ بلند سے جب فضائے خاطر کو ناپتا ہوں
تو کہتی ہے شانِ لامتناہی کہ اس کی حد لامکاں نہیں ہے

سہیل و شعریٰ و نسر طائر میں خطِ ساغر میں ڈھونڈ لیتا
اگر یہ پیرِ مغاں نہ کہتا کہ یہ خطِ کہکشاں نہیں ہے

برا جو کہتا ہے کہہ لے واعظ برا نہ مانیں گے رند ہرگز
کبھی ہے دل میں ملال رکھنا یہ رسمِ دیرِ مغاں نہیں ہے

چمن میں آ کر یہ میں نے جانا ہے اتفاق اصلِ شادمانی

یہ دو ہوائیں بھی ہیں مل کر یہ نہر آبِ رواں نہیں ہے
کمند موج شعاع پا کر چلی سوئے اوج مہر شبنم
سپند رہ رہ گیا تڑپ کر کہ درد دل کا زباں نہیں ہے
یہی تو ہے اس کا آستانہ نہیں بہت دور ہم کو جانا
وہ سامنے لامکاں نہیں ہے وہ حلقہ کہکشاں نہیں ہے
جھلک دکھا دی تھی کس نے اپنی کہ جوہروں میں تھا اک تلاطم
فضائے آئینہ ہو اداس اب وہ طوطیِ پرفشاں نہیں ہے
نہ اف کرو نگاہ تا کی دیکھو چھری جگر پر لگا کے دیکھو
مجھے ملالِ ستم نہیں ہے مجھے مجالِ فغاں نہیں ہے
نگاہ آبستنِ ہوس ہے۔ ہوس ہے آلودۂ مناہی
تو اس سے بہتر ہے کم نگاہی کہ کچھ تماشا یہاں نہیں ہے
ملا کے ہونی کو اے مسافر چلا شب تار میں کدھر تو
کہ غول صحرا کے شعبدے ہیں یہ آتش کارواں نہیں ہے
بھلا ہو ناداں واعظوں کا کہ میکدے کو کیا ہے رسوا
وگرنہ بادہ کشی کا چرچا کہاں نہیں تھا کہاں نہیں ہے
مقام تسلیم میں پہنچکر۔ اثر نہ خوف و رجا کا دیکھا
سنا یہ کرتے تھے واعظوں سے بہشت میں دھوپ چھاں نہیں ہے

یہ کیسی اے نظم چپ لگی ہے کہیں نہ رسوا کرے یہ تجھ کو
کوئی خموشی نہ ہوگی ایسی کہ جس میں کچھ داستاں نہیں ہے

۲۰۳ مفاعیلن مفاعیلن فعولن ۳۲

پھر اے ساقی کس آب آتشیں سے
کہ چھلکا خون رنگ ساتگیں سے

یہ کاوش خار صحرا اور یہیں ہے
چھٹا دامن تو الجھا آستیں سے

فلک شرما گیا اس کی جبیں سے
نہ بائے چاند زلف عنبریں سے

کبھی دیکھو ادھر بھی آنکھ اٹھا کر
اجازت لو نگاہ شرمگیں سے

فلک دیتا رہا سرمایۂ دہر
نہ اپنا ہاتھ نکلا آستیں سے

کشیدہ رہ نہ یوں اے دامن یار
لپٹنا سیکھ زلف عنبریں سے

مبارک نیم بسمل ہو کے مرنا
چھری پھرتی ہے دست نازنیں سے

قصاص آخر لیا قاتل سے میں نے
اوسے مارا نگاہ واپسیں سے

سفر کا میرے قصہ مختصر ہے
کہیں جاتا ہے آیا ہوں کہیں سے

بہت نازک ہے اے ناصح مرا دل
کہیں ٹوٹے نہ حرف دلنشیں سے

پلٹ جاتا ہے فوراً بات کہہ کر
یہ عادت سیکھ لی ہم نے نگیں سے

بتا کس خوں گرفتہ پر غضب تھا
لہو ٹپکا نگاہ خشمگیں سے

سبب گردوں کے خم ہونے کا یہ ہے
کہ جھک کر توڑتا ہے زمیں سے

شرار عشق دامن جل گئے بھڑکا
چراغ عقل گل کر آستیں سے

خوشی میں بھی نکالے غم کے پہلو — خدا سمجھے دلِ اندوہ گیں سے
اٹھائی آنکھ اس نے اور نہ دیکھا — نہ سنبھلا جام دستِ نازنیں سے
یہ شاخِ گل ہے اے بلبل کہ صیاد — کماں لے کر نکل آیا کمیں سے
بھلا محشر میں کیا واعظ سے امید — گنہ گار اس نے ٹھہرایا ہمیں سے
کھلا یہ سابقہ کے بعد ناصح — کہ حضرت آپ بھی ہیں کچھ یونہیں سے
سخن جب اصل ہی میں بے نمک ہو — تو کیا ہوتا ہے شورِ آفریں سے
عطائی دہر سے یوں ہاتھ کھینچا — شکن نکلی نہ اپنی آستیں سے
کہا اس نے قیامت ہو تو بولے — یہ مردہ کیا نکل آیا زمیں سے
عجب آزاد ہے دیوانۂ عشق — نہ دنیا سے غرض اوس کو نہ دیں سے
تری قربت کا اک زینہ ہے معراج — وہ منزل دور ہے عرشِ بریں سے
اشارہ تیری رحمت کا اگر ہو — لڑوں کشتی کراماً کاتبیں سے
وہیں ہو خار زار اے چرخ افسوس — چمن پیدا ہوئے جس سرزمیں سے
بلا انگیز ہے خالِ رخِ یار — زحل اترا ہے چرخِ ہفتمیں سے
خیالِ خال باندھا دل میں میں نے — ستارہ دیکھتا ہوں دوربیں سے
یہاں کس کو خبر دورِ فلک کی — کسے فرصت ہے دورِ ساتگیں سے
تعلی اہلِ رفعت نے نہ چھوڑی — گئی گردوں تک خاک اوڑ کر زمیں سے
نگاہِ مست نے رسوا کیا ہے — اوٹھا طوفان موجِ ساتگیں سے

جلائے نظم آئینہ پر اپنے
ہوئی گرد نگاہ عیب میں ہے

۲۰۴

خیالِ چشم فتاں ہر گھڑی ہے
لب اوس کا پھول کی اک پنکھڑی ہے
چلو صحرا کو یہ دہن ہر گھڑی ہے
یہ غم زلف و رخ پر یاد رکھنا
نہیں رنگ چمن کو پائیداری
دلِ غمگیں مرا وہ کربلا ہے
نظر کیا جانے شوخی اوس ادا کی
گھلا جاتا ہوں میں غم ہو کسی کو
لحد تک پھر تو ہے پیری ہی پیری
مجھے مار اتری اس نازکی نے
وہ آئے نزع میں بالیں پہ میری
یونہیں رہنے دو مجھ کو نیم بسمل
بھلا تم اور رحیداؤ دل کسی کا
ملے جائیں یہ منہ مانگی مرادیں

۲۴

اجل سچ کہتے ہیں سر پر کھڑی ہے
گراں حسن پر کہ مسی کی دھڑی ہے
یہی تدبیر مجھ کو بن پڑی ہے
کبھی کا دن کبھی کی شب بڑی ہے
یہ سمجھو فصلِ گل اک پھلجھڑی ہے
کہ لاشِ آرزو جس میں گڑی ہے
کہ یہ تلوار تو دل پر پڑی ہے
کوئی پوچھے کہ تجھ کو کیا پڑی ہے
غنیمت ہے جوانی جو گھڑی ہے
مہروی جب پڑی او جھی پڑی ہے
یہ ساعت نیک ہے اچھی گھڑی ہے
تمہاری دل لگی تو دو گھڑی ہے
سراسر جھوٹ ہے اور دو گھڑی ہے
کہ رندوں پر تری رحمت بڑی ہے

شہنشاہوں سے بگڑا رہتا ہو وہ
جسے تیری فقیری بن پڑی ہے

الٰہی تو دلِ بے آرزو دے
مجھے حسرت میں حسرت یہ پڑی ہے

مرے پاس آتے آتے رک رہے وہ
اسی سے سانس سینہ میں اڑی ہے

جہالت میں سلوکِ راہِ عرفاں
اندھیری رات ہے منزل کڑی ہے

میں پہلی ہی اسیری سے تھا سمجھا
کہ بانا عاشقی کا ہتکڑی ہے

نکالیں تو قدم وہ گھر سے باہر
قیامت ہاتھ باندھے ہی کھڑی ہے

متاعِ صبر پھونکی سوزِ غم نے
یہ چنگاری کہاں جا کر پڑی ہے

گنا ہوئی گھٹائے جائیں گے ستم
سنا ہے دھوپ محشر کی کڑی ہے

نہ ہو بیزار مجھ سے تو تو اے قبر
مری صورت گلی ہے یا سڑی ہے

وفا کہتی ہے اب جینے سے ٹل جا
ادا کہتی ہے ایسی کیا پڑی ہے

۲۰۵ — 19

وہ آئی فوجِ گل وہ برق چمکی
وہ اڑتی آتی ہے بیرق علم کی

مجھے خواہش ہے ساقی جامِ جم کی
بھلا ہو خیر تیرے دم قدم کی

یہ کہتی ہے صفِ مژگاں صنم کی
کہ راہیں بند ہیں دیر و حرم کی

نہ دیکھ اے نقشِ پا ان شوخیوں کو
تری آنکھوں میں خاک اس کے قدم کی

فلک نے کھلا رکھا ہے لالہ و گل
یہ لاشیں ہیں شہیدانِ ستم کی

سمجھ لے ہاتھ پھیلانے سے پہلے — چلیں گی برچھیاں لا و نعم کی
مجھے غش میں پڑا رہنا ہے بہتر — ہوا ہے گرم دامانِ کرم کی
ہمارے دور میں بھی ہے وہی جام — خرابی کی ہے جس نے ملکِ جم کی
جو میری طرح سے کھینچا دمِ سرد — تو سانس اُو کھڑی نسیمِ صبحدم کی
نہ کیوں قسمت پہ اپنی ہوں میں نازاں — کہ گنجائش نہیں ہے بیش و کم کی
نہ رکھنا زیست میں دم کا بھروسا — کسی نے کیا وصیت مرتے دم کی
وطن کو مڑ کے غربت میں جو دیکھا — تو اک زنجیر تھی نقشِ قدم کی
یہ دل ہے اور تیری عشق کا داغ — قسم ہے مجھ کو قندیلِ حرم کی
عطا چھٹ جائے تو چھٹ جائے لیکن — ادا چھٹتی نہیں اہلِ کرم کی
رہائی دامِ گیسو سے ہوئی یوں — چھٹیں نبضیں اسیرانِ ستم کی
وہ دل آفت زدہ وہ کوچۂ زلف — وہ تاریکی وہ راہیں پیچ و خم کی
گریباں تک نہ پہنچا ہاتھ اس کے — پشیماں ہو کے بھی گردن نہ خم کی
ضرور اب اعتبار آئے گا سب کو — قسم کھائی ہے میں نے جھوٹی قسم کی

حذر لازم ہے بدگویوں کو اے نظم
کہ ہے کالی زباں میرے قلم کی

۲۰۶ — غزل مشاعرہ بین السلطنۃ ذو الوزارتین دولت آصفیہ —

چہ سامانِ سیہ کاری نہ کردی — ولے کردی و پنداری نہ کردی

درین گلشن بسانِ نکہتِ گل
ز خود رفتی و خود داری نہ کردی

ورش از سجدہ تو دورتر بود
باندازہ نگوں سازی نہ کردی

مسرت بار معاصی بر نتابد
چرا فکرِ سبکباری نہ کردی

خلاف ساز آبروے عشق آریں بس
چو بر رخ اشکِ غم جاری نہ کردی

ازیں خوابِ گرانِ غفلت اے وائے
تو گاہے قصدِ بیداری نہ کردی

برایں عقلِ تو واعظ آفریں است
کہ غم خوردی و غمخواری نہ کردی

من از تو ایں سخن باور نہ دارم
کہ دل بردی و دل آزاری کردی

جزاک اللہ کہ رازِ عشق را فاش
تو در مستی و ہشیاری نہ کردی

عفاک اللہ کہ درایں کوچۂ عشق
لحاظِ ذلت و خواری نہ کردی

شدہ راز عطایت فاش اے شاد
کہ پنہانش ز بسیاری نہ کردی

خدا بودہ است آمرزندہ اے ظلم
نہ کردی بیش او زاری نہ کردی

مفاعیلن چار بار

14 ۲۰۷

نہ جی بہلا مرا بوے گل و رنگِ گلستاں سے
رہا آوارہ مثلِ گرد باد اٹھ کر بیاباں سے

نگہ بے باک بکھری کاکلیں سر کا ہوا آنچل
ڈرانا اس طرح آنکھ آئینہ کی چشمِ حیراں سے

غلامی کرکے شاہی مصر کی پائی تو کیا پائی
نہ یوسف کو مناسب تھا نکلنا چاہِ کنعاں سے
ہوا سے کھل رہے ہیں پھول یہ ماجرا دیکھا
کہ جاتے ہی ترے اوٹھنے لگے شعلے گلستاں سے
تڑپ تجھ میں نہیں اے آہ گرنا دیکھ بجلی کا
اثر تجھ میں نہیں اے درد اوٹھنا سیکھ طوفاں سے
جہاں فانی ہے لیکن ہے دلیل ہستی باقی
وجودِ سایہ ہو جس طرح خورشید درخشاں سے
ہوا دل غم سے پھر اضطراب اب بھی نہیں جاتا
بچانا شیشۂ ناموس یارب سنگ لرزاں سے
مجھے نشو ونمائے تختۂ سوسن کا شک گزرا
وہ اک پرواز تھی طاؤس کی صحنِ گلستاں سے
عجب کیا نرگسِ بیمار کی آنکھوں میں نور آئے
یہ یاد ہے کہ سرمہ اوڑ کے آیا ہے صفاہاں سے
میں اہلِ ہوش کی اس چارہ سازی کا ہوں دیوانہ
بنائیں طوق اوسے گھٹتا ہو دم جس کا گریباں سے
ادب کا ہے تقاضا ہاتھ میرے باندھ دے کوئی

انہیں خو ہے الجھ پڑنے کی ناصح کے گریباں سے
نگاہِ غور کی جس شخص نے اپنی حقیقت پر
تو شرما کر نہ پھر اس نے اٹھایا سر گریباں سے
بسانِ سیل ہم قطعِ تعلق کرتے رہتے ہیں
بہ شکلِ موج گر پیدا گریباں ہو گریباں سے
پلا پھر نظم کو جامِ جنوں انگیز اے ساقی
کہ دردِ سر نہ ہو خمیازۂ چاک گریباں سے

۱۷ ولہ ۳۰۸

نہ اب نکلوں گا ساری عمر کوئے مے پرستاں سے
کہ دیکھی میں نے ہمدردی یہیں انساں کو انساں سے
ملا ہے گل فشانی کا سبق مجھ کو گلستاں سے
گہر ریزی مرے خامہ نے سیکھی ابرِ نیساں سے
ہر اک ذرہ یہ چشمک جھانک کر روزن سے کرتا ہے
کہ میں واقف ہوں تحلیلِ شعاعِ مہرِ تاباں سے
سماں اب تک شبِ عشرت کا پھرتا ہے نگاہوں میں
نکل آنے کو تھی سلمائے فطرت خود شبستاں سے
غلط ہے اس سرا میں راحلہ ہستی کا کب ٹھہرا

مگر ہاں کچھ پتا ملتا ہے اس کا گرد جولاں سے
اثر تا عرش پہنچا اک نگاہِ حسرت آگیں کا

ستم ظلم اُٹھ گیا ہے جنبشِ دامانِ مژگاں سے
نہ ہو انسان کبھی ممنونِ منت ایسے ویسوں کا

زمیں میں گڑ گیا ہوں میں فلک کے بارِ احساں سے
کئے دیتی ہے بیخود بوئے گل ہاتھوں میں رعشہ سے

سنبھل اے باغباں گرنے نہ پائیں پھول داماں سے
شکستِ مدعا کا سامنا ہے دونوں جانب سے

کسی کا دل ہے نازک تر کسی کے عہد و پیماں سے
رخِ روشن پر اک خالِ سیہ میں دیکھ کر سمجھا

عروجِ ماہ میں اوترا یہ تارا اوجِ کیواں سے
پتہ ملتا نہیں راتوں کو اب خوابِ پریدہ کا

غرض کیا طائرِ نکہت کو فکرِ شبستاں سے
در اہلِ کرم سے راہ چلتے فیض پاتے ہیں

صبا اکثر معطر ہو کے نکلی ہے گلستاں سے
ٹھکانہ اور بھی کوئی ہے کیا خانہ بدوشوں کا

کدھر جاتا ہے دیکھیں گردباد اٹھ کر بیاباں سے

غبار رہ گزر ہے رہروؤں کا ماجرا سن لو
خبر اوڑتی ہوتی آئی ہے کچھ شہر خموشاں سے

مجھے بے صبر کیوں کہیے خطا ہے اشک خوں کی ہے
کہ عادت ہے ٹپک پڑنے کی اوس کو نوک مژگاں سے

صدف کا سا جگر رکھو تو ہو آبستن گوہر
شکایت بے نگریوں کی عبث ہے ابر نیساں سے

زباں کج مج ہے اور دعوی ہمیں رنگیں خیالی کا
شفق پھولے گی اب کے نظم خون گرمی و تپاں سے

۴ وله ۳۰۹

رعایا خوش ہے شہ کے بذل ظاہر فیض پنہاں سے
پہنچتی ہے طراوت خشک و تر کو فضل باراں سے

کیے ہیں انتظام ایسے ہوئے ہیں انتخاب ایسے
دکن نے پھیر گئے دن عہد عثمان علیخاں سے

عجب کیا ہے زمینیں سب کی آج آباد ہو جائیں
یہ سختیاں ہیں گزرنے کو ہو مطلب بیاباں سے

عجب کیا ہے سنا کر عشق سلطانی کا افسانہ
رسن میں باندھ کر شیروں کو لے آئیں نیستاں سے

اکیلا چھوڑ کر رخصت ہوئے سب اہلِ محفل سے
خدا معلوم دو دو اشک بھی نکلے تھے کس دل سے

سنا جادو کو چل جاتے ہوئے کاجل کے بھی تل سے
نکل آیا ہے اک تنہا سا فتنہ چاہِ بابل سے

اسیری میں بھی آزادی میں بھی رونا رہا ہم کو
قفس میں آئے بھی تنگی سے پھر نکلے بھی مشکل سے

ریاضت کشتِ زار آرزو کی سعی بے جا ہے
وہی اچھے رہے کچھ ہاتھ دھو بیٹھے جو حاصل سے

فلک کی گردشیں ہیں اور جائے امن ناپیدا
بھنور میں کشتیِ عمرِ رواں ہے دور ساحل سے

نہیں بحرِ فنا میں ڈوب مرنے کے سوا چارہ
بلا پانی نہ چلو بھر کسی پیاسے کو ساحل سے

ہزار آنکھ اے فلک ہے تیرے کشتے کی تماشائی
تماشے جھلملے ہیں آئینہ داریِ بسمل سے

تعلق سے جہاں کے اس طرح آزاد ہو جا تو
نکل جاتا ہے نالہ جس طرح طوق و سلاسل سے

میں اک افسردہ دل ہوں جاؤں کیونکر بزم عشرت میں
چمن میں بج رہا ہے ارغنوں صوت عنادل سے

میں اک شوریدہ سر ہوں مجھ کو لے جاؤ نہ دریا پر
نہ دیکھا جائے گا موجوں کا ٹکرانا بھی ساحل سے

شب غم میں ہوا ہے تجربہ یہ بارہا مجھ کو
اجل آتی ہے آسانی سے نیند آتی ہے مشکل سے

ذرا تو ہی بتا دے اب کدھر جاؤں کہاں بیٹھوں
جدا ہو کر ترے در سے نکل کر تیری محفل سے

حدی خواں دیکھنا ایسا نہ ہو پامال ہو جائے
ہزاروں حسرتیں لپٹی ہوئی جاتے ہیں محمل سے

غبار اپنا فلک فرسا رہا شاہد ہے خود گردوں
کبھی دب کر نہیں رہتے کسی مدمقابل سے

کبھی چھوڑا نہ ہم نے شیوۂ اہل مروت کو
کبھی جھپکی نہ اپنی آنکھ دشمن سے نہ قاتل سے

جو ہیں بیدرد اُن کا ذکر کیا جو جانیں وہ سمجھیں
تراوش دل کی بھی ہے پرافشانی بسمل سے

بڑے ہشیار ہیں اہل کرم بھی میں تو قائل ہوں

کہ جیتے ہیں اوس سے بڑھکے مرتے ہیں سائل سے

بہانہ ہو گیا ہے اوس ستمگر پہ برق خرمن کا
نجانے آہ نکلی تھی یہ کس گھٹتے ہوئے دل سے

ہمیں یہ بھی نہیں اب یاد حسرت کہتے ہیں کس کو
نہ آئی تھی کبھی دل میں نہ نکلی تھی کبھی دل سے

مرے غم سے کہیں احباب بھی غمگیں نہ ہو جائیں
یہی رہتا ہے اندیشہ کہ دل کو راہ ہے دل سے

رہی جب ناخن تدبیر میں باقی نہ گیرائی
کھٹکتی ہے جگر میں پھانس اب نکلی تھی جو دل سے

مکرنے میں ہے ظاہر تیرے چہرے سے پشیمانی
زباں سے قتل کا انکار ہے اقرار ہے دل سے

مرے پہلو سے آخر اوٹھ گیا وہ بدگماں ہو کر
ترے جانیکا شکوہ دل کو منھ سے ہے مجھے دل سے

نہ ہو جو بات دل سے کچھ مزہ اوس میں نہیں آتا
محبت چاہئے دل سے کہا اوس چاہئے دل سے

خدا ہی نظم کا حافظ ہے اب کہدو یہ حافظ سے
شب تاریک بیم موج کشتی دور ساحل سے

15 ۲۱۱

نہ قصر دلکشا رکھے نہ باغ جانفزا رکھے
بڑی جاگیر تو یہ ہے کسی کے دل میں جا رکھے

غرض اس پیر زال دہر سے کس کی بلا رکھے
نہیں میں ناز کش اس کا یہ ناز اپنے اوٹھا رکھے

رگ گردن پہ جس کو ناز ہو تو جھک کے مل اوس سے
یہ دار ایسا ہے جو تسمہ نہ گردن میں لگا رکھے

غم و شادی کو میں ایسا ہی سمجھا جس طرح کوئی
لگا لے خون دامن میں کر ناخن پہ رخسار رکھے

وہ حاضر ہے جدھر چاہے اودھر سجدہ کرے انسان
وہ ناظر ہے جدھر چاہے اودھر دست دعا رکھے

گواہی دے رہے ہیں روز محشر دست و پا سب کے
یہ حال اپنوں کا ہے غیروں سے پھر امید کیا رکھے

یہ کہکر ہاتھ دنیا سے اوٹھایا اہل ہمت نے
مناسب ہے وہاں کے واسطے بھی کچھ اوٹھا رکھے

تری سرکار سے میں آپ قناعت فیض کو پہنچا
تجھے اے قند ساری خلق کا حاجت روا رکھے

قعط دو فرحناں ہیں نعمت خوانِ پیر گردوں میں
اگر کھائے تو کیا کھائے اگر رکھے تو کیا رکھے

براق آیا زمیں پر عرش سے اور عرش پر پہنچا
فلک کو رہ گئی حسرت قدم پہ بادپا رکھے

نہ چھوڑیں گے ہم اپنی وضع گردوں لاکھ درپے ہو
اسیر قید غم رکھے گرفتار بلا رکھے

لحد میں مال و زر کچھ کام آئیگا نہ منعم کے
جسے خود کھود کر گاڑا ہو امید اوس سے کیا رکھے

کسی کے کوئی کام آتا نہیں وہ وقت آیا ہے
کہ انساں ہاتھ سے اپنے لحد اپنی بنا رکھے

جہاں میں آئے ہیں تنہا ہی اور تنہا ہی جانا ہے
بشر کا ہیکو دو دن کے لئے جھگڑے لگا رکھے

کسی کو ملک و مال آساں نہیں دیتا کبھی گردوں
اگر یوسف بھی ہو پہلے کنوئیں اوس کو جھکا رکھے

11 ولہ 212

یہی ہوں بندوں میں اوسکے جو محبت کی نظر رکھے
میں احساں عمر بھر مانوں وہ احساں عمر بھر رکھے

ہمیشہ انتظارِ آمدِ بادِ سحر رکھے
بھروسہ زیست پر مثلِ چراغِ رہ گذر رکھے

یہاں جو خار ہے دامن کشِ برقِ تجلی ہے
قدم راہِ سلوک و معرفت میں دیکھ کر رکھے

جو محرم ہو نہ راہِ شوق کا اوس کو یہ مشکل ہے
نظر بھی سوچ کر ڈالے قدم بھی دیکھ کر رکھے

نزاکت راہ چلنے کو ہے مانع بات کرنے کو
حسیں ہو کر بھلا کچھ تو دہن رکھے کمر رکھے

سکھاتا ہے غرورِ حسن یوں عاشق کشی اوس کو
زمیں پر پاؤں کیوں رکھو کہ وہ قدموں پہ سر رکھے

دبستانِ وفا سے پڑھ کے یہ دو حرف میں نکلا
کسی کا ہو رہے خود یا کسی کو اپنا کر رکھے

کبھی ششدر نہ ہو اس تختہ نرد دہر میں پھنس کر
نکل جانے کو اپنے راستہ چلنے کو گھر رکھے

صدا ہے طائرِ قبلہ نما کی پر فشانی میں
فلک دے لاکھ گردش منہ جدھر رکھے اودھر رکھے

بہت سے دل میں ہیں مضمون جمع لب تک آتے جاتے ہیں

مناسب ہے، مجھے بھی ساتھ اپنے نامہ بر رکھے

قدح کش نظم ہے لیکن نہ ایسا بھی کہ اے واعظ
شراب کبر و نخوت شیشۂ توبہ میں بھر رکھے

۲۱۳ ۱۵

ملا تھا ایک ساغر زہر غم سے نیلگوں وہ بھی
ستم ہے اوس پہ تغیر اے فلک جلد سی فزوں وہ بھی

اثر ہوتا نہ ہرگز اہل دل پر صور محشر کا
صدائے چنگ ہو گی یا صدائے ارغنوں وہ بھی

بہار باغ اک ہنگامہ ہے چاک گریباں کا
شگفتہ ہم جوش گل تھے کشتۂ جوش جنوں وہ بھی

کسی کو ناز تھا جوہر پہ اپنے اور زیبا تھا
ہوا ہے نام کی خواہش میں لیکن سرنگوں وہ بھی

ہدف ہونے سے دل کو کس طرح کوئی بچا لیتا
نگاہ اس کج ادا کی اور نگاہ پرفسوں وہ بھی

تڑپ کر دل جو رہ جاتا تھا سہارے وہ تو جاتا تھا
غنیمت سمجھے اک فرصت صبر و سکوں وہ بھی

فغاں کرنے پر اوس وادی میں تیار ہے آمادہ

چھپے رہنے سے دل میں بن گئی سوز دروں وہ بھی
جہاں ہے وارمانم شیوہ گردوں سے ظاہر ہے
کہ پہنا ایک ہی خرقہ ہمیشہ نیلگوں وہ بھی
ملے دنیا بھی اور عقبیٰ بھی یہ تو ہو نہیں سکتا
کہے جاتی ہے لیکن حرص میری یہ بھی لوں وہ بھی
تباہی میں کبوتر کی طرح تھا کوکب طالع
ہوا آخر شکار پنجہ نکبت زبوں وہ بھی
کسی عیار نے باتیں بنا کر لے لیا دل کو
فسانہ میں تو سمجھا تھا مگر نکلا فسوں وہ بھی
نہیں اب دادخواہی کی ہوس اے داور محشر
کہ میں بھی ہوں پشیماں شرم سے ہے سرنگوں وہ بھی
مجھے روز سیہ میں سایہ اپنا یاد آتا ہے
کہ میرے ساتھ تھا آوارہ دشت جنوں وہ بھی
کہوں قصہ میں واعظ عنفوان نوجوانی کا
حدیث عیش رفتہ سن کہ تھا خیر القروں وہ بھی
کوئی حرف تمنا ضبط کرتا ہوں جو اے حیدر
تو آنکھوں سے ٹپک پڑتا ہے بن کر اشک خوں وہ بھی

ملی تھی راہ میں منزل سراب عمر فانی کی
یہاں نقش قدم سے اپنے تو نے کیا نشانی کی

صدا یہ آرہی ہے دور سے برگِ خزانی کی
کبھی ہم نے بھی لوٹی تھیں بہاریں زندگانی کی

کسی پہ دل کا آنا موت تھی عہدِ جوانی کی
نہ بھولوں گا اسے یہ جان ہے ساری کہانی کی

کرامات صفا سے قلب کو پوچھو تو شبنم سے
فروغ شمع قرباں لے اوڑی اک بوند پانی کی

تجلی بھی ہوئی آخر تو موسیٰ نے نہ کچھ دیکھا
چکا چوندھ ایسی تھی آنکھوں میں برقِ لن ترانی کی

غبار اوٹھ کر ادھر منزل کی جانب چند گام آیا
یہ ٹھوکر پڑ گئی کس رہ نورد کاروانی کی

کوئی حد بھی ہے پستی کی ہزاروں سال جب گزرے
تو ہم تک روشنی پہنچی ہے شعرائے یمانی کی

بگولوں میں نظر آتی ہے خاک و باد کی کشتی
عیاں ہے برق و باراں سے لڑائی آگ پانی کی

خیال آیا نہ مجھ کو حیف بعض الظن اثم کا
پشیماں ہوں کہ ناصح سے میں نے بدگمانی کی

حکومت کا غرہ ہم نے اوٹھایا پڑھ کے شاہوں سے
کہ اپنے نفس سرکش پر ہمیشہ حکمرانی کی

خجالت سے خضر کا منہ چھپانا ہی مناسب ہے
کہ خواہش اور پھر وہ بھی حیات جاودانی کی

علم رکھتا نہیں گر تو قلم سے نام پیدا کر
مقام رشک ہے شہرت درفش کاویانی کی

یہ ہے نادر مرقع کارگاہ نظم کا حیدر
کہ ہیں لفظوں کے آئینہ میں تصویریں معانی کی

۲۱۵ ولہ ۱۱

بڑا غم ہوگا قتل عاشق ناشاد و مضطر سے
یقیں ہے تیغ قاتل خون روئے چشم جوہر سے

بھلایا حسن دنداں سے لب نازک کی خوبی کو
بجھا دی آتش یاقوت تونے آب گوہر سے

خرام ناز تیرا دیکھ کر ایسا عرق آیا
کہ آخر نقش سارے دھو گئے طاؤس کے پر سے

جو نازک طبع ہیں وہ سخت دل کے منہ نہیں لگتے
نہ باور ہو لڑا کر دیکھ لو شیشہ کو پتھر سے

حسینوں کی نزاکت دیکھ کر دھوکا نہ کھا جانا
کہ رخسارے تو ان کے پھول سے ہیں دل ہیں پتھر سے

خدا کے سامنے ہوگا خرامِ ناز کا شکوہ
گواہی دل کے پس جانے کی لینگے اہلِ محشر سے

اگر اونکی طرح میری پلک جھپکی ہو تو کہہ دیں
لڑائی آنکھیں میں نے رات بھر ایک ایک اختر سے

کرامت تو نے رندوں کی نہیں دیکھی ہے ای زاہد
بڑھا کر ہاتھ بھر لیتے ہیں ساغر حوضِ کوثر سے

اثر دیکھے کوئی بیتابیٔ دل کے جو مضموں ہیں
مرا مکتوب آگے جاتا ہے بالِ کبوتر سے

کسی کے شوقِ آرائش نے کی غارتگری کیسی
لیا اشتاق سے دل آئینہ چھینا سکندر سے

مروت نام کو تجھ میں نہیں ای برق کیا کہنا
لگا دی آشیاں میں آگ ورنہ تھی ہما اوپر سے

وله

۲۱۶ ۱۲

پری تھی آئینہ خانہ میں عکسِ حسنِ دلبر سے
صدا پرواز کی آئی پر افشانی جوہر سے

سنو تم وصفِ مے ہم سے سنا ہے نے پیمبر سے
پیمبر بن کے آئے ہیں زبانِ موجِ کوثر سے

جنوں میں سر کو ٹکرانا کبھی خالی نہ جائے گا
پری شیشہ سے اور شیشہ نکل آئیگا پتھر سے

سبک سر ہو کے جو خفت اوٹھائی ہو نہ کچھ پوچھو
گیا میں ڈوبنے پانی نہ اونچا ہو سکا سر سے

کھلا جب سے کہ سب تیرے اشارے کے کرشمے ہیں
جگر کو تیر سے اک عشق ہے گردن کو خنجر سے

سنبھل کر ہر قدم راہِ فنا میں چاہیئے رکھنا
کہیں دیوار بن جائے نہ اوٹھ کر گرد ٹھوکر سے

شبِ یلدا مری آبستن صبحِ قیامت ہے
مجھے محشر کے فتنے جھانکتے ہیں چشمِ اختر سے

صبا نے اے گل رکھوائے تیرے حواس آخر
کہا رازِ نہفتہ فاش اور ہنستا بھبکا اوپر سے

سویدا اے دل سوزاں سے کیا اسپند کو نسبت
کمال ضبط تو یہ ہے دھواں اٹھے نہ مجمر سے

نہیں ہیں بے نہنگ تیز دنداں جاتا ہوں میں
عبث ہے فکر اب پانی تو اونچا ہو چکا سر سے

جو ہو حاصل دل روشن نہ کر لاف نسب ہرگز
صفا میں آئینہ کی فرق آجاتا ہے جوہر سے

غنیمت کیوں نہ میں سمجھوں دل پر درد کو حیدر
کہ یہ دولت جو ملتی ہے تو ملتی ہے مقدر سے

۲۹ ولہ ۲۱۷

شب ہجر میں اگر یاد آئے فلک وہ آفتاب آئے
یقیں ہے خرمن ہستی تو برق اضطراب آئے

شب غم میں کیسی پہلو نہیں ممکن کہ خواب آئے
تو کیوں کروٹ بدلوانے کو جوش اضطراب آئے

بہ رنگ مشک تر بالوں پہ گو رنگ خضاب آئے
نہیں ممکن جوانی کی سی رخ پر آب و تاب آئے

مروت اے ظالم کو نہ کچھ شرم و حجاب آئے
جو کچھ کہیے تو سیدھی بات کا الٹا جواب آئے

روانی عمر کی ہے وادی ہستی میں سیل آسا
حباب و موج کے مانند ہم پا در رکاب آئے
بڑھاتا ہے عبث تو ہاتھ دنیا کی طرف ناداں
خبر لے ہوش کی مٹھی میں کیا موج سراب آئے
ترش روئی کی عادت تلخ کامی سے ہوئی پیدا
ہمارے سامنے ہو جائے مر کر گر شراب آئے
نکلتا ہے اشارہ جھلملانے سے ستاروں کے
ازل کے روز سے لے کر دل پر اضطراب آئے
میں کیا جانوں گنہ اے کاتب اعمال کتنے ہیں
یہ جھگڑے اوس سے کر جس کو حساب اکتاب آئے
عناں گیر اوس کے توسن کا ہو جذب شوق تنہا ہو
غبار ناتواں تا حلقۂ چشم رکاب آئے
الوہت کی بھی حد ہے اک نگہ اتنے کرشمے ہوں
حیا آئے حجاب آئے غضب آئے عتاب آئے
ترے کہنے سے میں توبہ تو کر لیتا ہوں اے واعظ
رہا جاتا نہیں پھر جھوم کر جس دم سحاب آئے
ہوائے سرد مہری چل رہی ہے سارے عالم میں

نہ ٹھہرا تا ہوا وقت سحر کیوں آفتاب آئے
فسانہ کی عوض اے داستاں گو پڑھ کوئی افسوں
اوتر آئے پری شیشہ میں گر آنکھوں میں خواب آئے
جہاں میں سرکشی کی ہم نے اس پر بھی شرار آسا
سراپا اضطرار آئے ہمہ تن اضطراب آئے
ملانا آنکھ پھر منہ پھیر کر تیوری چڑھا لینا
یہ مطلب ہے چھری وہ ماریے جس کو نہ تاب آئے
ہوا ثابت یہ جب دونوں کی ہستی اعتباری ہے
نہ کیوں گردوں سے پھر آنکھیں لڑانے کو حباب آئے
نہ آئے وہ ستمگر اور بہار اس طرح سے گذرے
تڑپ کر برق رہ رہ جائے گھر گھر کر سحاب آئے
نگاہِ شوق کے چلتے گیا صبر و قرار آخر
اسی رستہ سے شاید کاروانِ اضطراب آئے
نشاطِ عالم فانی ہے توام رنج و حرماں سے
سمجھے چشم پر خوں اوس کو گر جامِ شراب آئے
گذرتا ہے کچھ اس انداز سے لشکر حوادث کا
کہ اوڑ کر سر پہ گردوں کے غبارِ انقلاب آئے

خدا نے کی ہی جنت واعظوں ہی کے لئے پیدا
اگر یہ میکدہ میں بھی گئے ہو کر شتاب آئے

بقدر یک نگہ مہلت نہ دی جب انتظار اوس کا
تو مشکل ہے بقدر یک مژہ آنکھوں میں خواب آئے

بہت اصرار کرنے سی اوٹھائی تو ہی آنکھ اوس نے
مگر چتون یہ کہتی ہے کہ آئے اور حجاب آئے

اگر سو مرتبہ آئے بہار اے آسماں تو کیا
کوئی گردش تو کر ایسی کہ پھر فصل شباب آئے

یہ راتیں ہجر کی تارے ہی گنتے گنتے کٹ جائیں
فلک سمجھوں گا میں تجھ سے ذرا روز حساب آئے

سوا شام الم کے اور کیا دیکھیں گے دنیا میں
اوٹھیں اسوقت سو کر جب لب بام آفتاب آئے

حذر ہے زاہد سالوس سب کو تیرے سایہ سی
اگر آئے تو تھراتا ہوا تیر شہاب آئے

رواں ہے توسن عمر اور پڑی جم ہنیں سکتی
تو پھر کس طرح قابو میں یہ اسپ شتاب آئے

ادھر دل میں مری حسرت پہ حسرت بڑھتی جاتی ہے
ادھر شوخی پہ شوخی ہے شرارت بڑھتی جاتی ہے
زمانہ میں نہ لیگا نام کوئی عشق بازی کا
ہمارا سانحہ سن سن کے عبرت بڑھتی جاتی ہے
الٰہی دل ہے یا پرکالۂ آتش ہے پہلو میں
جو سوزش گھٹتی ہے گرد کدورت بڑھتی جاتی ہے
اودکھیں اللہ اکبر یہ خوشی گھر اپنے جانے کی
سحر کے ساتھ چہرے کی بشاشت بڑھتی جاتی ہے
جدائی میں ہر اشک حسرت دیدہ کا عالم ہے
کہ رونق گھٹتی جاتی ہے نقاہت بڑھتی جاتی ہے
دباتے جاتے ہیں لالہ کے تختے کوہ کا دامن
گھٹا کے ساتھ گلزاروں کی وسعت بڑھتی جاتی ہے
احبا گنتے ہیں گھڑیوں کے بدلے میرے نالوں کو
کہ جوں جوں رات جاتی ہے شکایت بڑھتی جاتی ہے
نہ پوچھو ہجر کی شب دم نکلنے میں ہے کیا لذت
چلی آتی ہے میٹھی نیند غفلت بڑھتی جاتی ہے
بہارِ گل میں ہے طاؤس آتشباز کا عالم

چمن میں پھول پھولوں میں شرارت بڑھتی جاتی ہے
زمین شعر سے کیونکر اوٹھاؤں میں قلم اپنا
کہ مثل نیشکر اس کی حلاوت بڑھتی جاتی ہے
نظر آتا ہے صحرا صاف بیٹھے بیٹھے زنداں میں
ہوا کی سو ہم گل میں لطافت بڑھتی جاتی ہے
یہاں درگاہ میں ہر روز چلّے باندھے جاتے ہیں
وہاں نام خدا ہر ایک منت بڑھتی جاتی ہے
بنا وان کا پھیکا تھا بہار آئی نہ تھی جب تک
مبارک ہو اوہیں مہندی کی رنگت بڑھتی جاتی
بہار آئی ہے کاٹے کھاتی ہے زنجیر زنداں میں
گریباں نے گلا گھونٹا ہے وحشت بڑھتی جاتی ہے
گلے سے میرے وہ خود آبدیدہ ہو کے لپٹے ہیں
خجل میں اگلی باتوں پر ندامت بڑھتی جاتی ہے
مسلمانوں کے اوس کافر ادا سے خون ہوتے ہیں
زمین کربلا کی روز قیمت بڑھتی جاتی ہے
سمجھ کر ہم کو اپنا شیفتہ اللہ رے ناز اون کے
جہاں تک منتیں ہوتی ہیں نخوت بڑھتی جاتی ہے

پتا حیدر کا دو دو دن نہیں ملتا احبا کو
نجانے کس پری رو سے محبت بڑھتی جاتی ہے

۲۰ ولہ ۳۱۹

بیانِ سوزِ غم کا ہیکہ اک طومار ہوتا ہے
کلیجہ اوس کا پک جاتا ہے جو غمخوار ہوتا ہے

اوسی پر حضرتِ واعظ کو کچھ اصرار ہوتا ہے
جو افسانہ بعید از عقل و دور از کار ہوتا ہے

دیے جاتے ہو غیروں کو تم ساغر بھرے جاؤ
عنایت مجھ پہ کیوں ہے مجھ سے کیوں اصرار ہوتا ہے

گواہی دیتی ہے چہرہ کی سرخی دیکھ لے ساقی
کہ شرمندہ ترے احسان سے میخوار ہوتا ہے

خطا کرتا نہیں گردوں سے جو تیر قضا آیا
نجانے کسکی چٹکی میں کب سوفار ہوتا ہے

ستم کا تیرے میں اے آسماں شکوہ نہیں کرتا
ترے ناوک میں اندازِ نگاہِ یار ہوتا ہے

اوسی دن سے ہوا ہے برق تجلی مشتعل تیرا
کہ دیکھا میں نے گلشن میں فروزاں خار ہوتا ہے

تڑپنے لوٹنے کا تھا فروغ عہد جوانی تک
گئی فصل جنوں اب دردِ دل بیکار ہوتا ہے

مجھے ظلِ ہما کی آرزو ہرگز نہیں ہوتی
میرے سر پر جب اوس کا سایہ دیوار ہوتا ہے

مژہ اس راستی پر بھی رہا کرتی ہے کج مجھ سے
شکایت اوس کی کیا ابرو تو پھر خمدار ہوتا ہے

جہاں میں کامیابی ہے کرشمہ جوشِ ہمت کا
اگر یہ لہر آجاتی ہے بیڑا پار ہوتا ہے

ہوا اور وہ پھر دیر یہ سب تیرے خزانے ہیں
وہ مل جاتا ہے فوراً جو مجھے درکار ہوتا ہے

تجھے دشوار سا دشوار بھی آساں سے آساں ہے
مجھے آسان سے آسان بھی دشوار ہوتا ہے

اگر دنیا میں استغنا ہو مرنا بھی ہے آساں
ہوس ہو گر تو جینا بھی بہت دشوار ہوتا ہے

کھلا یہ رمز تابِ آفتاب و شبنمستاں سے
ٹھہر سکتی نہیں آنکھیں ہی جب دیدار ہوتا ہے

گذرگاہِ فنا میں یہ تماشا دیکھتا ہوں میں

کہ تھم جاتا ہے گرد دریا رواں کہسار ہوتا ہے
قضا کس آئینہ خانہ میں دوڑاتی ہوئی لائی
بشر کو سانس لینا بھی یہاں دشوار ہوتا ہے
حذر اے آسمان کنہ مرادوں کے ستانی سے
او لجھ پڑتا ہے وہ جو زیست سے بیزار ہوتا ہے
صفائے دل کو ساتھ اپنے لئے جاتا ہوں مرقد میں
کہیں اب حشر تک میلا کفن کا تار ہوتا ہے
رسائی چاہتا ہوں نظم اپنی کعبۂ دل تک
تو پہلے سد رہ بت خانہ پندار ہوتا ہے

۲۲۰ ۲۱

پھنسا دینگے غزالان حرم اپنا حرم پہلے
وہ پھینکیں تو کمند طرۂ زلف رسا پہلے
طبیعت میں کہاں تھا خود پرستی کا مزہ پہلے
بھلا آئینہ کب تھا قبلۂ ناز و ادا پہلے
نہ تھے ہم بیش ازیں آگاہ حال عشق بازی سے
نہ تھا معلوم دل آتا ہے پہلے یا قضا پہلے
ہوئی ہے صبح کیا جلد آج کی شب وہ جو مہماں ہیں

وہی یہ رات ہے جسکی نہ تھی کچھ انتہا پہلے
بہار آئی ابھی میں نغمۂ بلبل نہیں سنتا

مبارکباد کی دے شیشۂ توبہ صدا پہلے
نجانے کوئی حیلہ نکلے یا ہو عیش کا ساماں

گلے کا ہار ٹوٹے پہلے یا بند قبا پہلے
خدا نے خیر کی منہ کیا دکھاتا تیرہ بختی کو

سر بالین تربت شمع سے آئی ہوا پہلے
شب فرقت میں کی اس رشک عیسیٰ نے مسیحائی

سحر کی دے گئی مجھ کو خبر باد صبا پہلے
مجھے ابتک نہیں بھولا تصور دست رنگیں کا

تمہارے ہاتھ سے جاتا رہا رنگ حنا پہلے
تہیا اے جنوں اپنا بھی ہے کوہ و بیاباں کا

چلے ہم بھی نکل جائے وہی یہ کالی گھٹا پہلے
جواب افسوں طرازی میں نہ اس کا ہے نہ اُس کا ہے

قلم ٹوٹے مرا پہلے کہ موسیٰ کا عصا پہلے
زمیں سے کس طرح احباب کے تھمنے سے میں اٹھوں

اوٹھانا چاہیے اوس بے وفا کا نقش پا پہلے

اوڑتی ہے نسیمِ صبح آنچل روئے روشن سے
چھپا لے مطلعِ خورشیدِ تاباں کو گھٹا پہلے

انھیں بیتابیوں نے اس کے کوچہ سے نکلوایا
کہ جاتے ہی اوٹھایا پردۂ دولت سرا پہلے

زباں تک بھی پہنچنا ضعف سے دشوار ہے اب تو
نکل جاتی تھی وہ دو تیر تک آہِ رسا پہلے

وہ کوٹھے پر چڑھیں گے برق باراں کے تماشے کو
الٰہی غیر کی آنکھوں میں چھا جائے گھٹا پہلے

خضر کیا جانیں کیا لذت ہے مرنے میں حسینوں پر
پشیمانی اوٹھائی ہے لیا آبِ بقا پہلے

برا ہوتا ہے دھڑکا ساتھ والوں کے بچھڑنے کا
کبھی سننے میں آتی تھی نہ فریادِ درا پہلے

سما سکتا نہیں اب پیرہن میں حسنِ روز افزوں
نہ یوں ہر روز ٹوٹا کرتے تھے بندِ قبا پہلے

شکایت کیسی اولٹی منتیں کرنا پڑیں آخر
یہ شوخی تھی کہ خود ہی ہو گئے ہم سے خفا پہلے

حجاب آئے اُسے کیونکر نہ شبنم کے ٹپکنے میں

کسی کی آنکھ پڑتی بھی نہ حیدر جا بجا پہلے

۲۲۱ وله ۱۲

اوڑا کر کاگ شیشہ سے مے گلگوں نکلتی ہے
شرابی جمع ہیں میخانہ میں ٹوپی اوچھلتی ہے
بہار میکشی آئی چمن کی رت بدلتی ہے
گھٹا مستانہ اوٹھتی ہے ہوا مستانہ چلتی ہے
ز خود رفتہ طبیعت کب سنبھالے سے سنبھلتی ہے
نہ بن آتی ہے ناصح سے نہ کچھ واعظ کی چلتی ہے
یہ کس کی ہے تمنا چٹکیاں لیتی ہے جو دل میں
یہ کس کی آرزو ہے جو کلیجہ کو مسلتی ہے
وہ دیوانہ ہے جو اس فصل میں فصدیں نہ کھلوائے
رگ ہر شاخ گل سے خون کی ندی اوبلتی ہے
سحر ہوتے ہی دم نکلا غش آتے ہی اجل آئی
کہاں ہوں میں نسیم صبح پنکھا کس کو جھلتی ہے
تمتع ایک کا ہے ایک کے نقصان سے عالم میں
کہ سایہ پھیلتا جاتا ہے جوں جوں دھوپ ڈھلتی ہے
بنا رکھی ہے غم پر زیست کی یہ ہو گیا ثابت

نہ لپکا آہ کا چھوٹے گا جب تک سانس چلتی ہے

قرار اک دم نہیں آتا ہے خونِ بے گنہ پی کر
کہ اب تو خود بخود تلوار رہ رہ کر اوگلتی ہے

جہنم کی نہ آنچ آئے گی میخواروں پہ او واعظ
شراب آلودہ ہو جو تیغ وہ کب آتش میں جلتی ہے

نہ دکھلانا الٰہی ایک آفت ہے شبِ فرقت
نہ جو کاٹے سے کٹتی ہے نہ جو ٹالے سے ٹلتی ہے

یہ اچھا شغلِ وحشت میں نکالا تو نے اے حیدر
گریباں میں اولجھنے سے طبیعت تو بہلتی ہے

۲۱ —— فاعیل مفاعیل مفاعیل مفاعیل —— ۲۲۲

ہے دل کو یہ منظور کہ چھپ جائے نظر سے
گیسو کا ارادہ ہے کہ بڑھ جائے کمر سے

آنکھوں میں جو رہتے تھے وہ اوجھل ہوں نظر سے
پوچھے یہ کوئی چاہنے والے کے جگر سے

آئینے میں گر برہمی طبع ہے ظاہر
اغماض ہے انداز سے تیور سے نظر سے

کٹ جاتی ہے آخر شبِ غم ہو کہ شبِ عیش

ہوتی نہیں کچھ رات سوا چار پہر سے

ہر اک حرکت کے لئے اک روز سکوں ہے

رفتارِ فلک کم نہیں پروازِ شرر سے

ہم بھی ہیں کھنچے سر دجو رہتا ہے کشیدہ

سایہ کے بھی طالب نہ ہوئے ایسے شجر سے

میں عکس ہوں اور آئینہ ہے گوشۂ عزلت

صورت نہ دکھاؤں گا جو نکلا کہیں گھر سے

ہو جاتا ہے رخسار کدبور کا وہ غمازہ

گلزار میں جو رنگ ٹپکتا ہے ثمر سے

پائی نہ خبر قافلۂ عمر رواں کی

پھر آئے پلٹ کر یہ مسافر نہ سفر سے

سو عیب تھے مجھ میں نہ رکھا ایک بھی منہ پر

شکوہ مجھے رہ جائیگا یہ اہل ہنر سے

انساں وہی انسان ہے جو مشتاق ہو اوس کا

کانوں سے سنا جس کو نہ دیکھا ہو نظر سے

اک دم میں بہارِ شب عشرت ہوئی آخر

گل ہو گئیں شمعیں نفسِ بادِ سحر سے

ہے دور میں ساغر کے یہاں جلوۂ خورشید
رندوں کا الگ دائرہ ہے دورِ قمر سے

جانے کا تری بزم سے رستہ نہیں ملتا
یہ بھی نہ رہا یاد کہ آئے تھے کدھر سے

عالم میں سخن فہم کسی کو نہیں پاتا
باتیں میں کیا کرتا ہوں دیوار و در سے

انداز نہ اپنا نگہِ مست نے چھوڑا
سو شیشۂ دل چور ہوئے گر کے نظر سے

کچھ وعظ میں شوخی ہے نہ انداز میں گرمی
محروم جو ہے زاہدِ خشک آتشِ تر سے

نکلا ہوں نہ نکلوں گا کبھی کوچے سے تیرے
اوٹھا ہوں نہ اوٹھوں گا کبھی میں ترے در سے

عزلت تری ہم کو بھی پسند آ گئی اے سرو
اب ہم نے بھی دامن کو لپیٹا ہے کمر سے

پھر ساغرِ جم ہو تو نظر بھر کے نہ دیکھیں
لبریز کیا جام کو جب خونِ جگر سے

اے نظم اوٹھا زانوئے غم سے نہ ترا سر

نکلا سر خورشید گریبان سحر

چھائی ہی محبت جو دم وصال بہار کسی کی
عبرت مجھے ہوتی ہی پٹنے پہ صدا کے
یوں ہر کہ نہ یاروں کی ہو بھاری تر امردہ
اچھی ہی گذر جاتی ہی انسان پہ بری بھی
پانسے کی طرح کروٹیں لیتا ہی ستارہ
گھستا ہی قلم سجدوں میں جبتک نہ گئے عمر
مارے ہوئے ہیں عشق کے نرگس ہو کہ گل ہو
اوس ترک کا کھنچیں گے گریباں سر محفل
سبزہ پہ بکھر جاتا ہی جب سبحۂ شبنم
مرقد ہی پہ بس جا کے تھمے گا فرس عمر
بوسے ترے پیکاں کے لیتا ہی کوئی زخم
تڑپا گیا دل کو مرے بجلی کا چمکنا
گرجی ہوئی دیوار زنداں کے ہمارے تھی
مرقد وہ جگہ ہی کہ اوتر جاتا ہی سر سے
بسمل ہوا جاتا ہوں تڑپتا نہیں لیکن

صورت نظر آتی نہیں جز یار کسی کی
اک بات اوٹھاتا نہیں کہسار کسی کی
یوں جی کہ طبیعت پہ نہ ہو بار کسی کی
رہ جائیگی آسان نہ دشوار کسی کی
ہے جیت کسی کی نہ سدا ہار کسی کی
کیونکر ہو زباں واقف اسرار کسی کی
زخمی یہ کسی کا ہے وہ بیمار کسی کی
ہاتھ آج کسی کا چلے تلوار کسی کی
پڑھتا ہی وہ تسبیح لگاتار کسی کی
کب ان کو مانے گا یہ رہوار کسی کی
پھبتی ہی ہنسی تا لب سوفار کسی کی
دکھلا گئی جھلکی مجھے ہر بار کسی کی
زنجیر میں دیکھی ہے یہ جھنکار کسی کی
آج اس میں کسی کا ہو کہ دستار کسی کی
مٹیوں کا جو خالی گیا تلوار کسی کی

واعظ ہو کہ ناصح ہو یہ ہے فصل بہاری
ہم رند اوٹھائیں گے نہ زنہار کسی کی

کچھ پاس ہے تم کو نہ فلک کو نہ اجل کو
آنکھوں میں مروت ہے نہ اے یار کسی کی

دل سے وہی باتیں میں کیا کرتا ہوں ہر روز
کیا دل میں اتر جاتی ہے گفتار کسی کی

کاٹوں میں گلا اور نہ گردن پہ چلے تیغ
تقدیر سے چلتی نہیں زنہار کسی کی

پامال کرے شوق ہے مجھ کو سر محشر
سیکھی ہے قیامت نے جو رفتار کسی کی

وہ رشک مسیحا نہیں آتا تو چلے ہم
دیکھے گا نہ اب راہ یہ بیمار کسی کی

چھپ کے کبھی دیکھوں تو جھپ جاتی ہیں نظریں
اتنی بھی نہ ہو طاقت دیدار کسی کی

تم غیر سے ملنے کو مکرتے تو ہو لیکن
جھوٹے ہی قسم کھائی ہے سو بار کسی کی

کیا ضبط محبت نے گلا گھونٹ کے مارا
فریاد بھی جیسے کہ گنہگار کسی کی

میں پاؤں پہ گرتا ہوں اٹھائی فتنۂ محشر
ملتی ہے تری چال سے رفتار کسی کی

رعشہ سا نظر آتا ہے شاخ گل تر میں
لرزے ہے یہ کلائی جو ہے تیار کسی کی

۲۲۴ ——— وله

کیا عاشق ناشاد کو وہ شاد کریں گے
آئیگا اگر رحم تو بیداد کریں گے

یہ تیرا ستانا بھی بہت یاد کریں گے
ماتم ترا برسوں دل ناشاد کریں گے

جب وہ کوئی طرز ستم ایجاد کریں گے
یاد آؤنگا میں مجھکو بہت یاد کریں گے

رہ جائیگی بات اور نکل جائیگا یہ ابر
ای پیر مغاں ہم تجھے کیا یاد کریں گے

۲۲۵ ——— مفعول مفاعلین دوبار ———

یہ ذوقِ تماشا کا حاصل نظر آتا ہے
اندھیر اب آنکھوں سے تا دل نظر آتا ہے

تو آپ ہی اپنے میں حائل نظر آتا ہے
اور آپ کو پا جانا مشکل نظر آتا ہے

عالم میں گراں ہا یہ بس دل نظر آتا ہے
پلہ یہ ترازو کا مائل نظر آتا ہے

جلدی ہے پہونچنے کی مجھکو درِ جاناں تک
اک ایک قدم اب تو منزل نظر آتا ہے

گرداب سرِ رہ ہے کشتی کو بچا کر چل
کترا کے نکلنے میں ساحل نظر آتا ہے

ای ذوقِ نوا سنجی پھیری ہے چھیری تو نے
طوطی پس آئینہ بسمل نظر آتا ہے

بس ایک ہی پرتو کا سارا یہ کرشمہ ہے
اب آئینہ خانہ بھی محفل نظر آتا ہے

دے آئینہ دل کو پرواز کدورت سے
اندیشہ خود بینی باطل نظر آتا ہے

کشتی ہو جو طوفانی اوس وقت خدا اسکو
منجدھار سے لے کرتا ساحل نظر آتا ہے

بیدار خدا سے ڈر توڑ اسکو نہ ای گلچیں
مجھ کو تو ہر اک غنچہ اک دل نظر آتا ہے

بس نام ہی نام اب تو سنتی ہیں محبت کا
اس نقطہ کا بھی کوئی محمل نظر آتا ہے

گنجینہ معنی ہے ضائع نہ کر اس دل کو
اب اس میں دو عالم کا حاصل نظر آتا ہے

حسن اور محبت کا لازم ہے نہاں رہنا
اک جان نمایاں ہے کب دل نظر آتا ہے

گرد رمِ آہو ہے یا رنگ پریدہ ہے
جو تجھ سے لے کرتا محمل نظر آتا ہے

یارب یہ سویدا ہے کس کے دلِ پرخوں کا
برگِ گلِ لالہ میں جو تل نظر آتا ہے

کشتی کو لگا دے یہ ای بادِ مراد آکر
آغوش کو پھیلائے ساحل نظر آتا ہے

تھا ان ہے وہی انساں او ظالم و جاہل بھی
جو بارِ امانت کا حامل نظر آتا ہے

یارانِ سخن گو سب اک نظم میں اہل دل
اس بزم میں تو لیکن بیدل نظر آتا ہے

۲۲۶ — فعلاتن مفاعلن فعلات — ۱۹

ہوں جو مہمان رات بھر کے لئے
حشر برپا کریں سحر کے لئے

سوز دل کیا بجھی کہ آپ آئے
آگ لینے کو لمحہ بھر کے لئے

جتنے عشوے تھے چشم ساقی میں
اوٹھے ساغر حباب کر کے لئے

تیری زینت گھر سے گیا ہو گی
آبرو ہو گئی گہر کے لئے

پہلے جو دامن و گریباں تھا
اب ہے رومال چشم تر کے لئے

پہلے ہاتھوں سے تھامتا تھا جگر
ہاتھ ترسا ہوں اب جگر کے لئے

دم رفتار حشر نے اوٹھ کر
قدم اوس شوخ فتنہ گر کے لئے

کیوں لگائی ہے ڈاٹ کافی تھا
ایک چھلا تری کمر کے لئے

نزع میں میں نے ہر طرف دیکھا
آپ آئے نہ لمحہ بھر کے لئے

ہم تو سمجھے تھی زیست ہی کو غذا
لاکھ ہیں آفتیں بشر کے لئے

عرش کے کنگروں پہ نالوں نے
ٹھوکریں کھائی ہیں اثر کے لئے

زاہد آئے جو بزم میں ساقی
رہنے دینا نظر گذر کے لئے

سر کو رکھے ہوں خاک در پہ ترے
کہ یہ صندل ہے درد سر کے لئے

کیا غضب ہو گیا اگر دیکھا
دل تڑپتا تھا اک نظر کے لئے

نگہ التفات جس کی ہو | اوس کا بندہ ہوں عمر بھر کے لئے

موت کا ڈر تو کچھ نہیں لیکن | زادرہ چاہیئے سفر کے لئے

بے سروپا جو ہو کرے کیا فکر | پاؤں کے واسطے کہ سر کے لئے

کبھی کھلنا کلی کو ہو نہ نصیب | بند مٹھی رہے جو زر کے لئے

ہجر کی رات ہے یہ رات اے نظم
منتیں مانیے سحر کے لئے

۲۲۷ ——— و نہ ——— ۱۵

راز افشا کہیں نہ ہو جائے | فتنہ برپا کہیں نہ ہو جائے

حب دنیا کہیں نہ ہو جائے | دیکھ سودا کہیں نہ ہو جائے

کون واعظ کے منہ لگے جاکر | مفت جھگڑا کہیں نہ ہو جائے

خون دل آتے آتے اشکو ہنیں | تھوڑا تھوڑا کہیں نہ ہو جائے

دیکھ لے آنکھ بھر کے دنیا کو | یہ تماشا کہیں نہ ہو جائے

خواب مرقد میں بھی یہ دھڑکا ہے | حشر برپا کہیں نہ ہو جائے

ضبط نالے نہ کر دل بیمار | درد پیدا کہیں نہ ہو جائے

بڑھتے بڑھتے یہ کاکل شب رنگ | شب یلدا کہیں نہ ہو جائے

نازکو ہے خیال پردہ دری | کوئی رسوا کہیں نہ ہو جائے

نہ لب بام مجھ کو رلواؤ | لب دریا کہیں نہ ہو جائے

پھر نہ چہرے پہ چھوڑیئے زلفیں
پھر اندھیرا کہیں نہ ہو جائے

شام ہی سے سحر کا ذکر نہ کر
دل کو دھڑکا کہیں نہ ہو جائے

دل پر سوز پر نہ رکھو ہاتھ
ید بیضا کہیں نہ ہو جائے

صاف ہے چاندنی نہ الٹو نقاب
چاند دھبا کہیں نہ ہو جائے

اتنا دعویٰ نیاز کا اے نظم
ناز بیجا کہیں نہ ہو جائے

٢٢٨ ولہ ١٣

طرز دکھلا دے اوس کی قامت کے
پاؤں پڑتا ہوں میں قیامت کے

دن نہ گنئے اگر مصیبت کے
ہم تھے مہمان چند ساعت کے

میرا ساغر رہا نہیں خالی
صدقہ ہو جاؤں اس کی رحمت کے

دل لگا کر کوئی سنے تو کہوں
جو فسانے ہیں دل کی حسرت کے

وقت پر تم نے لی خبر ورنہ
مر گئے ہوتے ہم تو مدت کے

گر نہیں ہے ریا تو رندوں میں
ہیں یہ آثار اہل جنت کے

مشت خاک اور رہا ہی ایسی
کارخانے ہیں تیری قدرت کے

اے صبا تذکرہ وطن کا نہ کر
رہنے والوں سے دشت غربت کے

فاتحہ پڑھ کے لی جو ٹھنڈی سانس
جھلملائے چراغ تربت کے

کھل گیا راز دل کہ مدفن پر
پھول نکلے جگر کی رنگت کے

آدمی آدمی کے کام آئے
یہی معنی ہیں آدمیت کے

حشر پر رکھا وعدۂ دیدار
یہ کنائے ہیں کس قیامت کے

اپنے مذہب میں ہے یہی توحید
نظمؔ بندہ ہیں ہم محبت کے

۲۲۹ ——— فعولن چار بار ——— ۱۲

جو نالے لبِ پیرِ کنعاں سے نکلے
لئے ساتھ یوسف کو زنداں سے نکلے

اجل پر یہ تہمت قضا پر ہے بہتاں
یہ سب شعبدے چشمِ فتاں سے نکلے

وہ نازک طبیعت ہیں نامہ ہو ایسا
کہ طومار مضمون عنواں سے نکلے

اُتر آئے وہ پیچ سب میرے دل میں
جو کافر کی زلفِ پریشاں سے نکلے

کسی کو غش آجائے وقتِ نظارہ
ہوا بھی نہ ظالم کی داماں سے نکلے

عنادل کریں جب ہزاروں ہی نالے
تو اک آہ لبہائے خنداں سے نکلے

کھلا مجھ پہ واعظ کا زہدِ ریائی
یہ حضرت بھی کچھ نامسلماں سے نکلے

جنھیں رندِ بے باک سمجھا تھا زاہد
وہی لوگ کچھ اہلِ عرفاں سے نکلے

ق

کبھی ابر کے ساتھ پھرتے تھے ہم بھی
خیاباں میں پہونچے بیاباں سے نکلے

چھڑاتے ہوئے شاخِ گلبن سے دامن
اُلجھتے ہوئے سنبلستاں سے نکلے

کبھی گل کے رخسار پر منہ کو رکھا
کبھی پھڑکے سروِ گلستاں سے نکلے

غرض یہ کہ بزمِ خرابات میں بھی
گئے اور ہو کر پشیماں سے نکلے

اگر گوش گل تک رسا ہو گئی
تو شبنم در بے بہا ہو گئی

مری نالہ بر آب صبا ہو گئی
ابھی آئی تھی پھر ہوا ہو گئی

تھی فرصت عمر یا شمع تھی
ذرا جھلملائی فنا ہو گئی

نہ ہو حکم مبرم کہا اس نے کچھ
عیاں نقش ما سوا ہو گئی

گناہوں سے رندوں کے ظلمت جو تھی
سمٹ کر وہ کالی گھٹا ہو گئی

کرو قافلہ تک پہونچنے میں کد
بہت دور بانگ درا ہو گئی

گیا وقت پھر ہاتھ آتا نہیں
غضب ہے جو غفلت ذرا ہو گئی

ہے آپس میں اب تو عناد و نفاق
محبت وہ اگلی ہی کیا ہو گئی

گری تھی ابھی برق منکر نگاہ
وہ اٹھی گرے کے تیغ قضا ہو گئی

نظر کا نظر سے ملانا تھا
لڑائی کی اس پر بنا ہو گئی

زیادہ تمنا بھی اچھی نہیں
اجل آتے آتے خفا ہو گئی

ہوئی ہاتھ ملتے ہی ملتے تلف
جوانی تو رنگ حنا ہو گئی

۲۳۱ —— فاعیل مفاعلن مفاعیل —— ۱۰

بدعت مسنون ہو گئی ہے
امت مطعون ہو گئی ہے

کیا کہنا تری دعا کا زاہد
گردوں کا ستون ہو گئی ہے

رہنے دو اجل جو گھات میں ہے
مجھ پر مفتون ہو گئی ہے

حسرت کو غبار دل میں ڈھونڈھو | زندہ مدفون ہو گئی ہے
وحشت کا تھا نام اوّل اوّل | اب تو وہ جنون ہو گئی ہے
واعظ نے بری نظر سے دیکھا | مے شیشہ میں خون ہو گئی ہے
عارض سے قرین گلاب کا پھول | ہمرنگ کی دون ہو گئی ہے
مل کر دیو و ملک کی سیرت | طرفہ معجون ہو گئی ہے
بندہ ہوں ترا زبان شیریں | دنیا ممنون ہو گئی ہے

حیدر شب غم میں مرگ ناگاہ
شادی کا شگون ہو گئی ہے

۲۲۲ —— تضمین دعائیہ —— ۱۴

فلک مطیع رہے بخت سازوار رہے | اساس دولت و اقبال پائدار رہے
یہ اوج منزلت و جاہ برقرار رہے | ہمیشہ خلق میں عثمان ترا وقار رہے

نبی کا لطف رہے فضل کردگار رہے

فروغ مہر پہ چشمک کرے نگین دکن | چمک سے جس کی فروزندہ ہو جبین دکن
فلک پہ سنبلہ ہو جائے خوشہ چین دکن | عروج پائے ترے دم سے سرزمین دکن

ترے قدم کا سر آسمان غبار رہے

اسی طرح سے رہے اوج موج شوکت میں | اسی طرح سے رہے لہر بہر دولت میں
یونہی نسیم طرب گل فشاں ہو صحبت میں | خزاں نہ آئے کبھی تیرے باغ عشرت میں

خدا کرے کہ ہمیشہ یہی بہار رہے

ہمیشہ سایہ رہے تیرا ملک و ملت پر | ہمیشہ دست عطا زر فشاں رعیت پر
کرم کی شان رہے اس عروج و رفعت پر | نگاہ لطف رہے وابستگان دولت پر

یہ باہمی جو تعلق ہے خوشگوار رہے

رہے جہاں میں تو حامی دین و دولت و داد | رہے خزانہ زر افشاں ہمیشہ ملک آباد
رہے زمانہ میں سرسبز تیرا باغ مراد | رہے نہال ترے سایہ میں تری اولاد

تری امید کا ہر نخل بر قرار رہے

جو خیر خواہ کے حق میں کرم ہے رشک سحاب | نگاہ قہر بد اندیش کو ہے برق عتاب
یہ مثل تیرے کرم کا نہ ہے ستم کا جواب | برنگ گل تر و تازہ رہیں ترے احباب

مثال زخم عدو تیرا دل فگار رہے

رہے مدام درخشندہ اختر طالع | کہ خیر خواہ کریں شکر نعمت صانع
یہ عرض نظم کی ہے جو ہے بندۂ تابع | دعا ہماری یہ دل سے ہے آصف سابع

مدام ملک دکن کا تو تاجدار رہے

۲۳۲ غزل و قصیدہ بطرح خسروی ۱۳۳۱

دزدیدہ نگاہیکہ بہ تیر قضا داشت | دل از کف من برد و جفا کرد و روا داشت
در دیدہ و دل شوق فراوان تو جا داشت | این ذوق جفا داشت و آن چشم وفا داشت
دل منزل خود آن طرف ارض و سما داشت | وہم است ترا اینکہ بہ پہلوی تو جا داشت

هر چند که گردون هوس جور و جفا داشت
از فکر بیاسود دلِ من که خدا داشت

تا عکس تو دافگند بشوخی و روان شد
آئینهٔ او حیرت نقش کف پا داشت

در دستِ حنا بستهٔ او دزدِ حنا بود
این دزد ندانم ید بیضا ز کجا داشت

خون ریختی و عربده ها کردی و شادم
دانم که بریں کار ترا ناز و ادا داشت

چون قافلهٔ بهم خرد و هوش روان شد
رنگیکه پرید از رخ من بانگِ درا داشت

فریاد ازیں عاقبت طالبِ دنیا
میرفت بسوئے عدم و رو بقفا داشت

آں طائر ناداں که بقید قفس آمد
بیچاره ندانست که در پیش چها داشت

دل دوخت بناوک کشش سرمهٔ جادو
دنبالهٔ او ره ز کجا تا به کجا داشت

در دولت این خسرو عادل عجب آنست
دیدم صف مژگاں که دو صد فتنه بپا داشت

برجستم و این مطلع برجسته بخواندم
پیش شه ذیشاں که لقب ظل خدا داشت

(مطلع)

۲۳۴ ۱۱

صد لطف بهرِ عاجز و مسکین شه ما داشت
شه دستِ کرم داشت و او دستِ دعا داشت

هنگام تکلم لبِ لعلش گهر افشاند
هر گوهر غلطاں بگره آبِ بقا داشت

صد نکته فزود است بدیوان سیاست
صد عقده گشود است بفکرے که رسا داشت

آوازه شنیدیم و دویدیم ببوسیش
سنگِ درِ او منزلتِ کوه صفا داشت

تا رایت اقبال تو بر اوجِ ظفر تافت
افشاند براهش پر و بالے که هما داشت

تا عدلِ شهی مژده امنے بجهاں داد
تائب شده گردوں که سر جور و جفا داشت

از تکرمتش ملک دکن تازہ جواں شد	شمشیر و گہر داد بہ پیرے کہ عصا داشت
تا مسند لیتش دست ضعیفاں بہ گرفت	دیدم پر کاہے کششش کاہربا داشت
تا از نفست باد بہاری بوزیدست	گلزار دکن از سر نو نشو و نما داشت
بدخواہ تو گشت است چناں عاجز و رسوا	دیدند کہ او پا بہ گل و سر بہ ہوا داشت

صد بار دم از ناز و تفاخر بزند نظم
بارے بہ صف حاشیہ بوسان توجا داشت

(نظام گزٹ سے منقول ہے) ۷

۲۲۵ اَمَّا بِنِعْمَةِ رَبِّكَ فَحَدِّثْ "اپنے پروردگار کی نعمت کا ذکر کرا" اعلیٰ حضرت ظل اللہ کا وجود ذی جود ایسی نعمت ہے جس کی تاریخ اوراق روزگار و صفحات قلوب پر ابد الآباد تک نقش رہے گی جسکی نعمتوں کی برکتوں کا شمار و احصاء زبان و قلم کے حیطۂ امکان سے باہر ہے یہ ترانہ سالگرہ بامتثال امر باری زبان قلم پر جاری ہوا۔

آٹھ معین قافیوں میں سات شعر کی قید تھی

(حیدر یار جنگ سید علی حیدر نظم طباطبائی)

جوشِ گل جوشِ طرب جوش بہار است اینجا
گل فشاں نغمۂ زمزمۂ ہزار است اینجا

از چراغاں شدہ ہر کوچہ و برزن پر نور
کہکشاں جادۂ ہر راہ گزار ست اینجا

شعلۂ و نغمۂ شمع ست بہم پیوستہ
تاج زریں ز طرب بر سر خار ست اینجا

من کہ در ظلِ خداوند خدا می بینم
چشم برہم زنم جلوۂ یار است اینجا

شام یک مژدہ امن ست و سحر مژدۂ عیش
ہر دو یک اند مگو لیل و نہار ست اینجا

شبِ این جشن و فلک عقدِ ثریا در دست
یعنی این سلکِ گہر بہر نثار ست اینجا

نغمۂ نظم کجا بار دریں بزم گہر سنجا
مجمعے خوش ز امیران کبار ست اینجا

۲۲۶ ملمع ۴۲

وارفتۂ حرفِ حق ہیں اہلِ توفیق
یہ موعظ پیرِ طریقت سمجھو

غسل بھی جو ہو تو جانتے ہیں مصری
طبتم ادخلتم علیہا اصری

رباعی

سالک کو فروتنی سے کب چارہ ہے
سالک وہ نہیں جو محو نظارہ ہے

دیکھو آنکھیں جو دونوں نیچی کر لیں
پہلے جو ستارہ تھا وہ سیارہ ہے

رباعی

آئینہ سے نیک نام اسکندر ہے
آئینہ جڑا ہوا انگوٹھی پر ہے
نام اس کا اسی نگینہ پر ہے کندہ
شاہی کا نگیں ہے نہ اب انگشتر ہے

رباعی

جو ظلم کیے تھے وہ ذرا سہہ تو سہی
انصاف خدا کے ہاتھ ہے رہ تو سہی
مظلوم بھی ہے داورِ محشر بھی ہے
ظالم نطقاً و سیفاً اب کہہ تو سہی

رباعی

جو معنی برجستہ ہیں سب بندھتے ہیں
جب بندھتے ہیں مضمون عجب بندھتے ہیں
ہیں کم سخن اس سے ہوں کہ شیریں ہے کلام
کھلتی ہے اگر زبان تو لب بندھتے ہیں

رباعی

دل کی حرکت کو اضطراری سمجھو
یہ طائرِ جاں کی بیقراری سمجھو
ہے عمرِ بشر چند نفس کی میعاد
جینے کو فقط نفس شماری سمجھو

رباعی

دنیا اک ہولناک ویرانہ ہے
اور طولِ اہلِ فسوں و افسانہ ہے
لالچ سے حذر چاہیئے غصہ سے گریز
وہ خوک ہے اور یہ سگِ دیوانہ ہے

رباعی

رباعی

افلاس میں اسلاف کی عزت تو رہی
زر جائے مگر گلوں میں نکہت تو رہے
ہر حال میں اخلاق کریمانہ رکھ
دولت تو نہیں رہی شرافت تو رہے

رباعی

دعوئی ہم کو یہ ہے کہ لائق ہم ہیں
بے علم و کمال سب پہ فائق ہم ہیں
کہتی ہے مگر ہماری تن آسانی
خود اپنے لئے مانع و عائق ہم ہیں

رباعی

سودا ہے ہزار طرح کا سر ہے ایک
خطرے لاکھوں ہیں اور خاطر ہے ایک
حرص و آز و حسد غضب جہل ہوس
ستار و ہزن ہیں اور مسافر ہے ایک

رباعی

ظاہر میں تو خاطریں مداراتیں ہیں
دل میں بیٹھا ہی جور اور گھاتیں ہیں
باقی نہیں ہم میں اتفاق کلمہ
جتنی منہ میں بس اتنی ہی باتیں ہیں

رباعی

کچھ دخل کوئی فہم کو دیتا ہی نہیں
اب تک نافہمیوں سے چھٹتا ہی نہیں
ہر بات ہی تیری میری دیکھا دیکھی
اب عقل سے کوئی کام لیتا ہی نہیں

رباعی

غافل ہیں ہمیں فکر پس و پیش نہیں
یعنی کہ مقدر میں کم و بیش نہیں

سو مرتبہ حادثوں نے کھولی ہی آنکھ — اب بھی نظر عاقبت اندیش نہیں

رباعی

ایسا بھی کہیں حد سے گذر جاتے ہیں — جو دل میں آ گئی وہ کر جاتے ہیں
چھپتے نہیں اطوار ہماری اے نظم — لوگ ایسے ہی جو الم رجاتے ہیں

رباعی

دریا میں ہوں اور اہل نظر پیاسا ہوں — پہلے سے بھی اب تو بیشتر پیاسا ہوں
سچ کہتے ہیں آب شور ہے یہ دنیا — میں ڈوب کے مر گیا مگر پیاسا ہوں

رباعی

ہر عضو بدن نزع میں گھل جائے گا — یہ جسم حسین خاک میں رل جائے گا
تا زیست تو کی ہے پردہ داری اے نظم — مرقد میں مگر خضاب کھل جائے گا

رباعی

میں تا لب گور عمر بھر میں آیا — دم میرا لبوں پہ اس سفر میں آیا
اس طرح سے پیری نے مروڑا مجھ کو — جو زلف میں خم تھا وہ کمر میں آیا

رباعی

جس کو نہ غم مآل اچھا ہوگا — پھر خاک اسے اندیشۂ فردا ہوگا
کیفیت حال میں ہر ایک شخص ہے مست — یہ فکر نہیں کسی کو اب کیا ہوگا

رباعی

گو اب نہیں مال و جاہ و دولت باقی
سو مرتبہ ہو جائے زوالِ نعمت
باقی ہے خدا اور اس کی رحمت باقی
سب کچھ باقی ہے گر ہے ہمت باقی

رباعی

کیوں سو رہے جا کے گور کی منزل میں
کچھ شعر لکھے تھے وہ سنانے اے نظمؔ
خالی تھی جگہ ان کے لئے تو دل میں
افسوس کہ میکش نہیں اس محفل میں

تاریخیں

تہنیت عقد ثانی اعلحضرت خلد اللہ ملکہ و سلطنتہ

ہے آج جشن کہ سرکار عقد میں لائے
عروس آئینہ رخسار و ماہ سیما کو
زہے شکوہ سلیماں کو مل گئی بلقیس
زہے فروغ کہ یوسف ملا زلیخا کو
تو جا کے بزم میں اے نظمؔ عقد کی تاریخ
یہ عرض کر کہ مبارک حضور والا کو
۱۳۴۱ھ

تاریخ تعمیر کتب خانہ آصفیہ

بنا نمود کتب خانہ آصف ہفتم
رساند ذروہ اعلیٰ بہ اوج مرتخش
نوشت نظمؔ دعا گو چو دید بنیانش
کہ ھٰذہ الکتب القیمہ ست تاریخش
۱۳۴۹ھ

تاریخ ترجمۂ وکار آف ویکفیلڈ

ترجمہ اردو میں انگریزی فسانہ کا ہوا
واقعی باتیں لباسِ قصۂ انساں پہنے ہوئے

ایک مصرع میں ہوئی تقریظ بھی تاریخ بھی | ہے فرنگن زیورِ ہندوستان پہنے ہوئے (۱۳۰۳ھ)

تاریخ طبع دیوان میرزا ذاکر حسین یاس مرحوم

ہر شعر سے حسن خوش بیانی نکلے | ہر لفظ سے لطف نکتہ دانی نکلے
اے نظم چھپے نہیں یہ اشعار تمام | پتھر سے چشمۂ معانی نکلے (۱۳۰۶ھ)

تاریخ ولادت نواب شہنواز جنگ بہادر

کیا ستارہ سا پسر حق نے دیا | حسن میں ہے غیرتِ ناہیدیہ
دایہ سے حیرت میں ہاتف نے کہا | آگیا ہے گود میں خورشید یہ (۱۳۱۲ھ)

تاریخ مثنوی ضیائے دکن

جناب مولوی باقر حسن نے | لکھے کیا پُر ضیا و روشن اشعار
مضامین انکے سب ہیں دُرِ غلطاں | قلم کا ہے سواد ابرِ گہر بار
یہ شیرازہ ہے یا موتی گندھے ہیں | خجل ہے عقد مروارید کا تار
ہوا ہے نظم یہ مصراع تاریخ | یہ سب اشعار ہیں لولوی شہوار (۱۳۰۸ھ)

تاریخ دیوان حبیب کنتوری مرحوم

چھپ گیا کیا خوب دیوان حبیب | اسب سخنور محوِ نظارہ ہوئے
نظم میں نے طبع کے گن کر سنین | کہہ دیا تیرہ سے اٹھارہ ہوئے (۱۳۱۸ھ)

تاریخ دیوان نواب نبو صاحب رفعت مرحوم

فکر رفعت کی بلند اور طبیعت رنگین | کہنا اس طرح ہے قابو میں جسے کہتے ہیں

اونکے دیوان کی تاریخ یہ لکھی میں نے | سحر ایسا ہی اس اردو میں جیسے کہتے ہیں
(۱۳۰۰ھ)

مجھے ہمیشہ سے تاریخ کہنے سے انکار ہی تاریخ فن شعر میں داخل نہیں ہے مگر مجبور ہو کر کہہ بھی لیتا ہوں۔ نواب عزیز یار جنگ بہادر مرزا داغ مرحوم کے ایک خوش فکر شاگرد ہیں میرے پاس آئے اور اپنے دیوان کی تاریخ کہنے کے لئے مجبور کیا میں نے یہ مصرع کہا:۔

"داغ کا انداز اس دیوان میں ہے"
(۱۳۳۶ھ)

تاریخ وفات نواب معتمد الدولہ بہادر مرحوم

بسکہ ہے آبستنِ[۱] موت وحیات
جو کوئی اس دارِ فنا سے گیا
اوٹھ گیا اس بزم سے حیف ایک امیر
رہ گیا نیکی کا زمانہ میں ذکر
غم سے بُرا حال ہے احباب کا
نام بھی مرحوم کا تاریخ بھی

حیف یہ عبرت کدۂ ایرماں[۲]
پھر کے نہ آیا وہ کبھی پھر یہاں
باذل وذی رتبۂ و والا مکاں
مٹ گیا ایثار و کرم کا نشاں
درد والم دل میں ہے لب پر فغاں
ہیں اسی اک بیت سے دونوں عیاں

معتمد الدولہ بہادر نے ہائے
کوچ کیا سوئے نعیم جناں
(۱۳۲۸ھ)

۱۔ آبستن بمعنی حاملہ ۲۔ ایرمان بمعنی عاریت ۱۲

تاریخ وفات علی فرزند سید محمد تقی صاحب

ماں باپ کی آنکھوں میں تھی تیرہ و تاریک
ذی الحجہ کی تیرھویں یہ رحلت سے علی کی
افسوس کہ بس اک سال اور آٹھ مہینے
کیا گھر میں اُجالا تھا طلعت سے علی کی
اس واقعہ کی اے نظم فصلی ہے یہ تاریخ
اندھیرے ہے دنیا میں فرقت سے علی کی

(۱۱۰)   —   (۱۴۴۰)

تاریخ وفات استاذ علامہ جناب قائمۃ الدین رحمۃ اللہ تعالیٰ

مَاتَ الفقیہُ الالمعیُّ المقتدیٰ
وقد استباح الکنزَ مِن عُلیا التقیٰ
مذ لم یزل للذین قائمۃ و رکن
للھدایۃ والزمان بہ اقتدیٰ
فنجوم اوجاتِ الشریعۃ قد ھوت
وسَراجُ انوارِ الھدایۃ قد خبیٰ
ارختُ عام الارتحالِ بمصرعٍ
لتزلزلت واٰللہِ ارکان الھدیٰ
۱۲۹۸ھ

تاریخ وفات سیّد بلگرامی مرحوم

ہوش نے رامپور سے لکھا
کہ ہے رنج و غم و الم کا ہجوم

ان کے والد نے انتقال کیا
اور تاریخ میں کروں مرقوم

پڑھ کے خط میں نے کہہ دیا دو بار
اسّید بلگرامی مرحوم

سہرا بتقریب عروسی آغا سیّد حسن اطال اللہ عمرہٗ

سہرا یہ نوشہ کے جو ہے درِ عدن کا سہرا
عکس سے لب کے بنا لعلِ یمن کا سہرا

سہرے پہ آنچل جو پڑا ہو گیا دونا جلوہ
کہ ہے سہرا یہ دوپٹہ کی کرن کا سہرا

اور شہوار چمکتے ہیں ستاروں کی طرح
موتیوں کا ہے کہ پروین و پرن کا سہرا

چشمکیں کرتا ہے جھرمٹ یہ ستاروں کو کبھی
اور کبھی رنگ اوڑاتا ہے چمن کا سہرا

سب پڑھیں سورۂ اخلاص کی جا سورۂ نور
اک تجلی ہے رخِ جلوہ فگن کا سہرا

کیا چمک طرۂ دستار یہ نوشہ کے ہے
جس سے شرما گیا گھونگھٹ میں دلھن کا سہرا

یہ تجلی کسی نوشہ میں نہ دیکھی ہوگی
سہرا یہ خورشید کے جیب سے ہے کرن کا سہرا

آئینہ بیچ میں دیکھا کیا یہ راز و نیاز
اولجھا نوشاہ کے طرہ میں دلھن کا سہرا

گلِ عارض کی صباحت کا مسلسل ہے جو ذکر
یہ غزل ہے گلِ نسرین و سمن کا سہرا

بارور تو نے کیا نخلِ تمنا یا رب
تو نے دکھلا دیا اس رشکِ چمن کا سہرا

جوہری نے بھی نہ اس طرح پروئے موتی
جس طرح نظم نے لکھا ہے حسن کا سہرا

عبارت خاتمہ

یہ سب غزلیں مشاعروں کی ہیں یا گلدستوں کی طرحوں میں یا بعض بعض احباب کی فرمائشی زمینوں میں ہیں خود سے کبھی غزل نہیں کہتا، ردیفیں پوری نہیں ہیں اور الف بے کا پورا کرنا میں ہمیشہ سے فضول سمجھتا ہوں غزل میں مقطع کا ہونا نہ ہونا میرے نزدیک یکساں ہے، دیوان برسوں سے مرتب ہو چکا تھا مگر چھپنے کا وقت اب آیا ہے، میں نے پھر سرے سے آخر تک ایک نظر ان غزلوں پر ڈالی اور اکثر مقاموں میں تغیر و تبدیل بھی کی ہے۔ میری اردو بھی فارسی سے کم نہیں ہے میں نے فارسی کی طرحوں میں جو غزلیں کہی تھیں وہ بھی اس مجموعہ میں شامل کر دیں ان غزلوں میں جا بجا معشوقانہ اداؤں کی تصویریں کھنچی ہوئی ہیں۔

خدا زاہد پرست و رہبان منش لوگوں کی نظر بد سے اس ارژنگ معانی کو بچائے!

حور مقصودات فی الخیام کانھن اللولو المکنون

جعلنا من ابکارا عربا اترابا

ڈیروں میں رہنے والی غزال چشم عورتیں (اعرابیہ بدویہ) گویا کہ وہ در مکنون ہیں ہم نے ان کو کواری چاہنے والی سہیلیاں بنایا ہے۔

علی حیدر طباطبائی

کتبہ محمد عبدالستار کاتب مکتبہ ابراہیمیہ

غلط نامہ "صوتِ تغزل"

صفحہ	سطر	غلط	صحیح
۳	۱۴	فرد و بشر	فرد بشر
۴	۸	قیامت	قیامت
"	۱۲	سَرحَد	سرمَد
"	۱۴	موبد	موبَد
"	آخری خفی پہلی سطر	دو انگلیال	دو انگلیاں
	" دوسری	لغت میں موبد دونی طرح	لغت میں موبَد دونوں طرح
۵	۱۵	تعالی اللہ	تعالیٰ اللہ
۶	۳	کہاں ہے	کہاں ہے
"	آخری خفی سطر	سیوف اللہ ۱۲	سیوف اللہ پڑھو

۱۴	۱۷	اس قدر لی چٹکیاں	اس قدر لیں چٹکیاں
۱۵	۱	ہوئی الجھن بڑا	ہوئی الجھن بڑھا
۱۷	۷	شُعاع	شعاعُ
۲۴	۴	دھوت	دھوپ
۲۸	۲	کب اُس	کب اِس
〃	۷	(۱۷) ولہ	(۱۷) ولہ ۱۱۹۱
۳۲	۱۲	نہں یک	نہیں اک
۳۴	۳	ہُوا	ہوا
۳۵	۷	ہٹھی	مٹی
۳۹	۱	×	فعلاتن فعلاتن فعلاتن فعلات
〃	۹	مجھ کو	تجھ کو
〃	۱۲	جویارانہ	جو یارانہ
〃	۱۵	دلت چڑہا	دن چڑھا
۴۱	۷	میں	ہیں
۴۳	۱۶	نازہے	ناز سے
۴۵	۷	آہوں	آہو
〃	۹	ڈھلنا	ڈھلتا

۴۵	۱۳	بھی نہ آہی	بھی آہی
"	۱۷	آئے	آگے
۴۶	۱۲	مور ملخ	مور و ملخ
"	۱۴	حالم وجد	عالم وجد
۴۹	۴	مزا	مزا
"	۷	مضر	مفر
۵۰	۵	ہوگا	ہوگیا
"	۱۴	نظمہٗ	لطمہٗ
"	۱۵	نے لے	سے خضر لے
۵۱	۱۳	برق رہ گئی	برق بھی رہ گئی
۵۲	۱	گئے	آگئے
۵۵	۱۲	شبہُ	شُبہہ
"	۱۷	اژدحام	ازدحام
۵۶	۱۲	بہ بزم جلوہ الخ	اگرچہ رخصت الخ
"	۱۳	اگرچہ رخصت الخ	ہوائے ابر الخ
"	۱۴	ہوائے ابر الخ	بہ بزم جلوہ الخ
۵۷	۶	سیحا	مسیحا

<table>
<tr><th></th><th></th><th></th><th></th></tr>
<tr><td>۵۸</td><td>۷</td><td>قائل</td><td>قابل</td></tr>
<tr><td>"</td><td>۱۳</td><td>گیارا</td><td>گوارا</td></tr>
<tr><td>۵۹</td><td>۱۵</td><td>ٹھکا</td><td>کھٹکا</td></tr>
<tr><td>۶۰</td><td>۱۵، ۱۶</td><td>جیف بندہ</td><td>حیف بندہ</td></tr>
<tr><td>.</td><td>.</td><td>حال معلوم</td><td>حَال ق معلوم</td></tr>
<tr><td>۶۲</td><td>۱۴</td><td>کو</td><td>لو</td></tr>
<tr><td>۶۳</td><td>۲</td><td>گرہ</td><td>گریہ</td></tr>
<tr><td>"</td><td>۴</td><td>لیا</td><td>گیا</td></tr>
<tr><td>۶۵</td><td>۱۴</td><td>کہ</td><td>کے</td></tr>
<tr><td>۶۷</td><td>۲</td><td>یگایا</td><td>لگایا</td></tr>
<tr><td>۷۰</td><td>۱۴</td><td>مشکے بو</td><td>مشک بو</td></tr>
<tr><td>۷۱</td><td>۱۴</td><td>بھلا</td><td>بہلا</td></tr>
<tr><td>۷۲</td><td>۵</td><td>جوآبا</td><td>جواب آیا</td></tr>
<tr><td>۷۶</td><td>۴</td><td>۳۷</td><td>۲۳</td></tr>
<tr><td>"</td><td>۸</td><td>سرگہ</td><td>ہرکہ</td></tr>
<tr><td>۷۷</td><td>۱۲</td><td>بگزریم</td><td>بگزرم</td></tr>
<tr><td>۷۹</td><td>۱</td><td>|| ||</td><td>|۶۰| |۱۴|</td></tr>
</table>

۷۹	۳	عشقش بیامائم	عشقش بیا سائم
"	۸	ہم ست	ہم است
۸۲	۴	لہ	کہ
"	۱۱	میست	نیست
"	۱۶	حکاتے	حکایتے
۸۴	۵	بال وپری	بال پری
"	۱۴	غرض	عرض
۸۵	۴	۱۹	۱۱
۸۶	۱	کیطرح زمیں	کیطرح ولہ زمین
۸۷	۲	دورباش	دورباش
"	۱۱	سوال	سوال
۸۸	۳	مشک وبو	مشک بو
۸۹	۵	گشتی	کشتی
"	۱۱	صد	پر
۹۰	۹	دست ویا	دست وپا
"	۱۲	مائم	مائیم
"	"	ناعمر	مابہ عمر

۹۱	۱۵	نفس	نفس امارہ
۹۳	۵	تجھی	تجھے
"	"	چلاچل	چلا چل
۹۶	۷	لغزش	لغزش
"	۶	تعزر	تعزیر
"	"	حسینونکے	حسینوں کے
۹۹	۹	پہُرا	پہرا
۹۹	۱۱	ڈھلجانے	ڈھل جانے
۱۰۰	۵	ہیں	میں
۱۰۰	۶	افسانہ پہ پھر	افسانہ پر
۱۰۰	۱۵	یانہیں	بانہیں
۱۰۲	۱۱	پروانہ	پروانوں
۱۰۴	۲	کہ سے	کہ اسے
"	۶	آگے	آکے
۱۰۵	۱۴	پیر سر	پیر پر
۱۰۶	۱۳	آوازہ	آواز
"	۴	ارسی	آرسی

۱۰۷	۵	ضمیر سے	ضمیر نے
۱۱۶	۱	کہیں	کھائیں
"	۶	گرتاب	گرداب
۱۱۷	۱	میں بشر	میں ہے بشر
"	۱۷	گرساں لیطرف	گریباں کیطرف
۱۱۹	۶	ادھر	اُدھر
"	۱۶	چاہ وپیار	چاہ پیار
۱۲۰	۱	برزخ	برزخ
"	"	لکا	لگا
"	۴	پڑھ گیے	پڑ گیے
"	۱۷	رفتی	رُفتی
۱۲۱	۱۰	تشنہ لبلبلا	تشنہ لبہا
"	۱۴	بکشم	بکشتم
۱۲۳	۹	چاہ وپیار	چاہ پیارہ
۱۳۱	۶	وسانپ	دو سانپ
"	"	تھائے	کھائے
"	۱۶	باندھے ہو	باندھے رہو

۱۴۵	۱۱	تحقق	تحقیق
"	۱۲	نشنزبہ	نشتربہ
"	۱۶	کعبہ ونبر	کعبہ نبر
۱۴۷	۶	سکوسن	سکون
۱۴۸	۲	وہی چھلاسی کمرہی کی نہیں	وہی چھلاسی کمرہی کہ نہیں
"	۱۵	سننان	سنسان
۱۴۹	۴	نگہ مار	نگہ یار
"	۱۶	فریادو	فریاد
۱۵۰	۳	ماقی	باقی
۱۵۱	۱۷	آرادانہ	آزادانہ
۱۵۲	۱	منت ہستی کو کیا	منت ہستی کیا
"	۶	کہ یہ	کہ یہ
"	۱۵	تویہ	تویہ
"	۱۶	ادا سمجھوے	ادا سمجھائے
"	۱۷	متجب	تعجب
"	"	تھر	پتھر
۱۵۴	۷	وہ ہرسو	کہ ہرسو

۱۵۵	۱۵	ہی ہی	ہی یہی
۱۵۶	۱۷	عبرت سے	ذرا عبرت سے
۱۵۷	۱	چیڑہتے	چڑھتے
۱۶۱	۲	درو گوہر	زر و گوہر
〃	۶	ہونکہ	ہوں کہ
〃	۸	ٹہراے	ٹھہرائے
۱۶۳	۵	درویش وعی	درویش وغنی
۱۶۴	۵	ھربدہ	عربدہ
۱۶۵	۸	ہوگھ	ہوگھر
۱۶۶	۳	مضر	مضر نہیں
۱۶۸	۱	ہلال برق	ہلال وبرق
〃	۱۱	ریگ	ریگ
۱۷۳	۳	نبرش	بہ بزمش
〃	۱۵	میرے	میں ہے
۱۷۶	۱۵	یہی	یہی
۱۷۸	۱۶	خیر بھی سے	خبر بھی ہے
۱۷۹	۱۱	دور سے	درد سے

۱۸۱	۱۱	رضع	رضیع
"	۱۴	ترہانے	ہیں سانے
۱۸۵	۲	تری	تیرے
۱۸۶	۱	دود آھ	دود آہ
"	۱۱	توڑتا	توڑنا
۱۸۸	۱۶	وہ	جو
۱۹۱	۶	جیص بیص	حیص بیص
"	۹	ہوئے	ہوائے
۱۹۲	۴	آزاد بھی	آزاد ابھی
۱۹۳	۱۶	کی مسافت	کی بھی مسافت
۱۹۵	۳	سدیر و خوزلق	سدیر و خورنق
۲۰۰	۸	نگھ	نگہ
۲۰۵	۱۵	تیغ نو	تیغ تو
۲۰۹	۵	دمبالہ دار	دمبالہ دار
"	۱۰	بھی ہیں نشہ	بھی نشہ
"	۱۱	سلمنا	سامنا
۲۱۳	۱۰	بچلے	بچا کے

۲۱۴	۴	فراوانی	سلیمانی
۲۱۷	۱۶	مٹنے	ہٹنے
۲۱۸	۱۲	خود نمائی ہے کا	خود نمائی کا ہے
"	۱۶	نمائیشرہے	نمائیش ہے
۲۲۶	۱	دے کہ	دے کر
۲۲۸	۱	صدااالٹی	صداالٹی
۲۳۰	۹	چیشم بز	چیشم تر
۲۳۸	۸	کرہ	مگر
۲۳۹	۹	داد	داد لو
۲۴۴	۷	کرٹیں	کروٹیں
"	۸	لذت	صوت
۲۴۵	۱۷	مثل	مثل رقیب
۲۴۷	۷	لدورت	کدورت
۲۴۸	۹	سحرہے	سجہ ہے
"	۱۳	نسر	سحر
۲۴۹	۳	کیا	کیسا
"	۸	وہ	جو

۲۴۹	۱۶	ستوں	کشتوں
″	۱۷	ہمیں	کہیں
۲۵۱	۳	چاکر	چاہ کر
۲۵۶	۱۰	شک	سنگ
″	۱۶	شک	اشک
۲۵۷	۹	تو	کو
۲۵۹	۱۵	اونگلیاں	اونگلیائے
۲۶۰	۵	پلینے	پلٹنے
۲۶۳	۱۰	دیکھی ہے	دیکھی جو ہے
۲۶۴	۱۳	حسن	حسُن
۲۶۵	۱۰	دل کو دہر	دل کو کہ دہر
۲۶۷	۱	بھی	بہی
۲۶۸	۴	سائیتن	ساتگیں
۲۷۲	۱۷	سیہ کاری	جفاکاری
۲۷۳	۲	سازی	ساری
″	۴	فلاف	ملاف
″	۱۰	زاز	راز

۲۷۳	۱۲	بیش		پیش
۲۷۶	۱۷	گردباداوھ		گردباداوڈھ
۲۷۷	۶	کی		کو
"	۹	ولہ		قطعہ
"	۱۴	زمبیں		زمینیں
"	۱۷	نیساں		نیستاں
۲۷۸	۱	۲۱۰	۲۵	۲۱۰—ولہ—۲۵
۲۷۹	۹	جائے		جائیں
۲۸۱	۱۷	رنکھے		رکھے
۲۸۳	۱۷	بہتسے		بہت سے
۲۸۴	۶	اُس یہ		اُس پہ
"	۱۷	ہے		تھے
۲۸۶	۱	۲۱۴	۱۳	۲۱۴—ولہ—۱۳
۲۸۷	۲	کہ ناصح		کہ کیوں ناصح
"	۵	کا		کو
"	۱۷	تغش		نعش
۲۸۹	۱	۲۱۶	۱۳	۲۱۶—ولہ—۱۳

۲۸۹	۱۷	کہا	کیا
〃	〃	ہنستا ہے پر اوپر سے	ہنستا ہے اوپر سے
۲۹۰	۱۱	منک	مدت تک
۲۹۱	۹	گمتر	گر
〃	۱۱	اتنا ہو	اتنا تو
۳۰۰	۱۶	شوحی	شوخی
۳۰۵	۱۱	گلہ	گلا
۳۰۷	۸	پرواز	پرواز
〃	۱۴	دل بیار	دل بیمار
۳۱۲	۵	متل	محفل
۳۱۷	۱۵	طبتم اخذتم علیہا اصری	لِمُبتم اخذتم علیہا اِصری

مطبع انجمن امداد باہمی مکتبہ ابراہیمیہ مشین پریس

مطبوعہ

مکتبۂ ابراہیمیہ مشین پریس

حیدرآباد دکن

صرف ٹائٹل مطبوعہ شمس الاسلام پریس